الجامعۃ الاشرفیہ کا دینی اور علمی ترجمان

ماہنامہ

اشرفیہ

مبارکپور

شاہ است حسین بادشاہ است حسین
دیں است حسین دیں پناہ است حسین
سر داد نہ داد دست در دست یزید
حقا کہ بنائے لا الہ است حسین

نومبر ۲۰۱۰ء

مبارک حسین مصباحی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بیادگار: حضور حافظِ ملت علامہ شاہ الحاج عبد العزیز قدس سرہٗ بانی الجامعۃ الاشرفیہ

الجامعۃ الاشرفیہ کا دینی اور علمی ترجمان

ماہنامہ اشرفیہ
مبارکپور

زیر سرپرستی:

عزیز ملت حضرت علامہ شاہ الحاج عبد الحفیظ صاحب قبلہ

سربراہِ اعلیٰ الجامعۃ الاشرفیہ

نومبر ۲۰۱۰ء — ذوالحجۃ ۱۴۳۱ھ

جلد نمبر ۳۴ شمارہ ۱۱

مجلس ادارت

مدیر اعلیٰ: مبارک حسین مصباحی

نائب مدیر: محمد طفیل احمد مصباحی

سرکولیشن منیجر: محمد محبوب عزیزی

تزئین کار: مہتاب پیامی

مجلسِ مشاورت

مولانا محمد احمد اعظمی مصباحی

مفتی محمد نظام الدین رضوی مصباحی

مولانا محمد ادریس بستوی مصباحی

مولانا عبد المبین نعمانی مصباحی

ترسیل زر و مراسلت کا پتہ

دفتر ماہنامہ اشرفیہ، مبارکپور

اعظم گڑھ یو۔ پی۔ ۲۷۶۴۰۴

THE ASHRAFIA MONTHLY

Mubarakpur. Azamgarh

(U.P.) India. 276404

قیمت عام شمارہ: 15 روپے

سالانہ: 150 روپے

چیک اور ڈرافٹ بنام **مدرسہ اشرفیہ** بنوائیں

کوڈ نمبر ——— 05462

دفتر ماہنامہ اشرفیہ ——— 250149

الجامعۃ الاشرفیہ ——— 250092

دفتر اشرفیہ ممبئی فون/فیکس 23726122

سری لنکا، بنگلا دیش، پاکستان، سالانہ 500 روپے

دیگر بیرونی ممالک

20 $ امریکی ڈالر — 15 £ پونڈ

نوٹ: آپ ماہنامہ اشرفیہ ہر ماہ انٹرنیٹ پر بھی پڑھ سکتے ہیں۔

http://www.aljamiatulashrafia.org E.mail: info@aljamiatulashrafia.org

مولانا محمد ادریس مصباحی نے نشاط آفسیٹ پریس سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ اشرفیہ مبارکپور، اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

نقوش قلم

اداریہ

عہدِ حاضر میں مسلمانوں کی قومی و ملی نمائندگی

اہل سنت اور دوسروں کی سرگرمیاں

مبارک حسین مصباحی

۳۰ اکتوبر ۲۰۱۰ء کو مارہرہ مطہرہ میں تیسیری کل ہند فکر و تدبیر کانفرنس ہوئی۔ اس کانفرنس میں ہمیں خطاب کے لیے موضوع دیا گیا تھا «عہدِ حاضر میں مسلمانوں کی قومی و ملی نمائندگی-اہل سنت اور دوسروں کی سرگرمیاں» قوم و ملت کی مخلصانہ قیادت و نمائندگی عہد حاضر کا ایک حساس مسئلہ ہے۔ ملی بساط پر ہماری سرد مہری نے دینی بساط پر بھی ہمیں زبردست نقصان پہنچایا ہے۔ یہ ایک سچائی ہے کہ آزادی کے بعد سیاسی اور سماجی محاذ پر نہ صرف ہماری قیادت و نمائندگی نہیں رہی بلکہ ہماری موجودگی بھی کم رہی ہے۔ چند علاقائی تنظیموں اور فعال حضرات نے اس مہم کو باقی اور جاری تو رکھا لیکن علماے اہل سنت کا جمہوری مزاج اس سے ہم آہنگ نہ ہو سکا۔ بلکہ علما و مشائخ کا ایک بڑا طبقہ اس کو معیوب بھی تصور کرتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور پر اہل سنت کے جلسوں اور اعراس کے پوسٹروں میں یہ نوٹ لگا رہتا ہے: «موجودہ سیاست سے اس اجلاس کا کوئی تعلق نہیں ہوگا» بالکل اسی طرح جیسے بعض مسلم ہوٹلوں میں یہ بورڈ آویزاں رہتا ہے کہ «اس ہوٹل میں شراب نوشی کی قطعاً اجازت نہیں ہے» اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل سنت کا جمہوری مزاج قومی مسائل سے کنارہ کش رہنے لگا اور قوم و ملت کے مسائل سے عدم دل چسپی بلکہ بیزاری پاک دامنی کی علامت بن گئی۔ اگر انفرادی یا اجتماعی طور پر عام مسلم مسائل کے حوالے سے کوئی پیش قدمی کرتا ہے تو جماعتی سطح پر اس کی معتبریت مشکوک ہو جاتی ہے۔ گویا کہ قوم و ملت کے مسائل میں دل چسپی اور سرگرمی دکھانا اپنی گنہ گاری کا اعلانِ عام کرنا ہے۔ مقامِ افسوس ہے کہ آج ہندوستان میں مسلمانوں پر قیامتیں ٹوٹ رہی ہیں، مسلم نوجوانوں کو دہشت گردی کا الزام لگا کر گرفتار کیا جا رہا ہے۔ مسلم پرسنل لا کے خلاف عدالتوں میں مسلسل فیصلے ہو رہے ہیں، غریب مسلمانوں کے حقوق پامال کیے جا رہے ہیں، بلکہ انھیں غربت و افلاس کے گڑھوں میں دھکیلا جا رہا ہے۔ فساد زدگان اور سیلاب زدگان آئے دن موت و زیست کی کش مکش میں مبتلا ہوتے رہتے ہیں، تاریخی حقائق کا گلا گھونٹ کر آستھا کی دیوی پر بابری مسجد بھینٹ چڑھا دی گئی۔ میڈیا مسلسل مسلمانوں کے خلاف نت نئی سازشیں کرتا رہتا ہے۔ اس قسم کے بے شمار مسائل ہیں، غیر اہل سنت، دیوبندی، غیر مقلد اور اہل تشیع وغیرہ مسلمانوں کی نمائندگی کے نام پر شور و غل مچاتے رہتے ہیں۔ عوامی سطح پر مسلم لیڈران بھی کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے ہیں، مگر اس اسلام دشمن ہنگامۂ قیامت میں اگر کوئی بے حس و حرکت جماعت نظر آتی ہے تو وہ ہے عہدِ حاضر میں اہل سنت و جماعت۔ اس جماعت کا ہر چھوٹا بڑا عالم مسلمانوں کے عام مسائل سے اپنے آپ کو سبک دوش تصور کرتا ہے۔ بے چین اور مضطرب قوم اپنے سنی قائدین کی تلاش میں نکلتی ہے مگر اسے منہ کی کھانی پڑتی ہے۔ حالات کی چلچلاتی دھوپ میں اسے غیر اہل سنت کے خیمے ہی نظر آتے ہیں، پھر وہ مجبوراً وہیں سر چھپانے پر مجبور ہوتی ہے۔ اور مسئلہ صرف اتنا نہیں ہماری قوم صرف اپنے سیاسی اور سماجی مسائل میں ان کی ممنون کرم بن کر رہ جاتی ہے بلکہ اس کی ضرب ان کے عقیدہ و فکر پر بھی پڑتی ہے۔ پہلے عام لوگ ان کی قومی خدمت کے لیے اظہارِ تشکر میں رطب اللسان ہوتے ہیں اور پھر غیر شعوری طور پر ان کے دین و مذہب سے بھی متاثر ہوتے چلے جاتے ہیں، یہ ایک فطری بات ہے کہ عام طور پر قوم اپنے دین و مذہب میں اپنے قائدین کی جانب راغب ہوتی ہے۔

قومی و ملی مسائل سے ہماری عدم دل چسپی کا دوسرا نقصان یہ سامنے آ رہا ہے کہ ہماری حکومتیں اور ملکی و بین الاقوامی میڈیا بھی غیروں کو ہی مسلمانوں کا نمائندہ سمجھتے ہیں اور بنام مسلم قائدین حکومتوں کا فائدہ بھی انھیں کو پہنچ رہا ہے۔ اگر کوئی مسلکی اختلاف رونما ہوتا ہے تو حکومتی

عملہ اور سیاسی پارٹیاں آنکھ بند کر کے انھیں کی اعانت وحمایت کرتی ہیں۔ ہماری اس سیاسی بے چارگی کے نتیجے میں نہ جانے کتنی مساجد اور اور کتنے اوقاف ہمارے ہاتھوں سے نکل گئے۔

اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کا منظر نامہ کچھ اس طرح ہے کہ ملک وملت کا کوئی بھی مسئلہ ہو حکومت، عوام اور میڈیا کی نگاہ میں غیر اہل سنت کی تنظیموں اور شخصیتوں ہی کی جانب اٹھتی ہیں۔ مسلمانوں کے مسائل کے سلسلے میں پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ مسلم پرسنل لا بورڈ کی کیا رائے ہے، جمعیۃ العلما کی پیش قدمی کیا ہے، اہل سنت کا کوئی ایسا مضبوط پلیٹ فارم ہی نہیں کہ اس سے کوئی فیصلہ کن توقع وابستہ کی جا سکے، وزن شعری کے لیے کبھی کبھی علمائے اہل سنت کی رائے دریافت کر لی جاتی ہے مگر ان انفرادی آرا اور اخباری بیانات کا نہ حکومت کوئی اثر قبول کرتی ہے اور نہ عوام۔ مسلم پرسنل لا کے تحفظ کے نام پر شاہ بانو کیس میں ہم نے سرگرمی دکھائی تھی لیکن ہمارا کارواں چند خطبا کی جذباتی تقریروں سے آگے نہ بڑھ سکا اور جب تاریخیں مرتب ہوئیں تو علمائے اہل سنت کا تذکرہ کسی ذیلی سرخی کا حصہ بھی نہیں بن سکا، کیوں کہ تاریخیں انھوں نے لکھیں جن کے پاس مضبوط پلیٹ فارم تھا۔ ہم یہاں یہ وضاحت کر دینا بھی ضروری سمجھتے ہیں ملک بھر میں آپ کو اہل سنت کے جو ایم. ایل. اے. یا ایم. پی. نظر آتے ہیں وہ عام طور پر اپنی سیاسی پارٹیوں کے نمائندے ہوتے ہیں قوم وملت کے نہیں، کیوں کہ ان کا سیاسی وجود پارٹیوں ہی کی وفاداریوں کا نتیجہ ہوتا ہے، اگر وہ اپنی پارٹیوں کے مقابل ملت کی بے باک نمائندگی کرنے لگیں تو ان کی پارٹیوں میں ان کے لیے جگہ کہاں رہ جائے گی۔ ہمارے بعض علما اس خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ ہم بھی مسلم پرسنل لا بورڈ کے ممبر ہیں، اس سلسلے میں ہماری رائے یہ ہے کہ غیروں کی قیادت میں چند علمائے اہلِ سنت کی رکنیت وشمولیت ان کے ذاتی مفاد میں تو ہو سکتی ہے لیکن جماعتی نقطۂ نظر سے غیر مفید بلکہ انتہائی مضر ہے۔ مسلم پرسنل لا بورڈ کی کانفرنسوں میں ان کی بے وقعت شمولیت کا اہل سنت کے عوام پر بڑا غلط اثر پڑتا ہے بلکہ میڈیا کے ذریعہ ہندوستانی مسلمانوں اور حکومت میں یہ پیغام جاتا ہے کہ ملک میں اہل سنت بریلویوں کی تعداد اور حیثیت شیعوں سے بھی کم تر ہے۔ کیوں کہ بورڈ کی مکمل باگ ڈور غیروں کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ میڈیا میں بھی وہی نمایاں ہوتے ہیں۔ آخر جب اہل سنت کی تعداد غیروں سے زائد ہے تو اس جمہوری دور میں غیروں کا دُم چھلا بن کر جماعتی جگ ہنسائی کرانے کی کیا ضرورت ہے۔ بلکہ اس قسم کے جلسوں میں ہمارے چند علما کا نام سن کر ہمارے عوام بھی بڑی تعداد میں ان کے جلسوں میں پہنچ جاتے ہیں اور اس عوامی کثرت کا نقد سیاسی فائدہ غیروں کی جھولی میں چلا جاتا ہے۔ میری یہ گفتگو مشترک مسائل میں شرعی جواز اور عدم جواز کے محور پر نہیں بلکہ سیاسی اور جماعتی نقطۂ نظر سے ہے۔ میری اس رائے سے آپ اختلاف بھی کر سکتے ہیں۔ مجھے خوشی ہوگی کہ کم از کم اسی بہانے آپ کچھ دیر کے لیے تو قومی مسائل میں سر کھپانے کا اجر پائیں گے۔

اے میری قوم کے غیور علمائے کرام! حالات کا تیور سمجھنے کی کوشش کرو، قوم کے مطالبات ہر لمحہ شدید سے شدید ہو رہے ہیں، وہ اپنے مسائل کو لے کر غیروں کا منہ تک رہے ہیں۔ اب جماعتی جمود توڑنے اور جماعتی مزاج بدلنے کی ضرورت ہے۔ اب ہماری قومی بے حسی کے نتائج ہماری دینی بساط پر بھی براہ راست پڑ رہے ہیں۔ ہم میں سے ہر فرد اس کا ذمہ دار ہے لیکن جو جتنا بڑا دینی پیشوا ہے اتنا ہی بڑا قومی مسائل کا بھی ذمہ دار ہے «كلكم راع و كلكم مسئول عن رعيته» مگر ہمارے یہاں موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ جماعتی پیشوائی اور سربراہی کا سہرا تو ہر شیخ اور ہر عالم اپنے سر باندھنا چاہتا ہے، لیکن جماعتی اور قومی مسائل کے حل کے لیے کسی کے پاس وقت نہیں بلکہ قومی خدمت کرنا ان کی شانِ اقدس کے منافی ہے، کیا سید القوم خادمهم کی معنویت اب بالکل ختم ہو چکی ہے؟؟ ذرا ایک نظر اٹھا کر دیگر مکاتبِ فکر کا جائزہ لیجیے۔ جو جتنا بڑا دینی پیشوا اور مذہبی رہ نما ہے، اتنا ہی زیادہ قومی وملی مسائل میں سرگرداں نظر آتا ہے۔ میڈیا میں بھی ان کے اکابر ومشائخ پیش پیش نظر آتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کے ہر مسئلہ کے حل کرنے اور حل کرانے کی ذمہ داری محسوس کرتے ہیں، اسی لیے اہلِ سنت کے عوام بھی ان کی قومی قیادت کے لیے نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کی پیشوائی کا مقصد صرف نمازوں کی امامت اور سلاسل کی بیعت نہیں بلکہ بساطِ حیات کے تیز وتند حالات میں ان کی دادرسی اور رہ نمائی بھی ہے۔

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

حالات کے پس منظر اور پیش منظر میں اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان ناگفتہ بہ حالات کے باوجود کچھ دردمندان ملت

انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں اور ہزار طعن وتشنیع کے باوجود سیاسی اور صحافتی میدانوں میں کچھ کر گزرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ علمائے کرام کا جماعتی مزاج ہمارے عوام پر بھی بڑی حد تک اثر انداز رہتا ہے۔ ہماری قوم دینی وملی خدمت صرف اسی کو سمجھتی ہے کہ وہ آنکھیں بند کر کے مدارس اور خانقاہوں کی اعانت کرے۔ وہ ملی مسائل میں کسی قسم کے تعاون کو فضول خرچی اور مال کا ضیاع تصور کرتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مدارس اور خانقاہیں اہم دینی، علمی اور روحانی کام کر رہی ہیں، لیکن یہاں سوال قومی وملی مسائل میں اہل سنت کی نمائندگی اور قیادت کا ہے اور اہل سنت کا موجودہ نظام قومی مسائل کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے سے قاصر ہے۔ اس پر بحث کی ضرورت نہیں، بلکہ ہندوستان کا عہد آزادی ایک کھلی کتاب کی طرح ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔

قومی اور ملی مسائل میں اہل سنت کی نمائندگی کے مجرمانہ فقدان کو عوام وخواص سب شدت سے محسوس کر رہے ہیں، گزشتہ چند برسوں سے میڈیا کے راستے کی کچھ برف پگھلتی نظر آ رہی ہے۔ دیر سویر علمائے اہلِ سنت کا وجود بھی کسی کسی گوشے میں نظر آ جاتا ہے۔ ادھر کچھ تنظیمیں بھی اپنے اپنے حلقوں میں پیر مار رہی ہیں۔ جامعہ اشرفیہ کے سربراہ، اعلیٰ حضرت عزیز ملت نے تنظیم ابنائے اشرفیہ بھی انھیں خطوط اور انھیں مقاصد کے حصول کے لیے قائم کی ہے۔ وہ اپنے دائرۂ استطاعت میں سرگرمِ عمل ہے۔ اتر پردیش کے اکثر اضلاع میں اس کی ضلعی شاخیں اور متعدد صوبوں میں صوبائی شاخیں قائم ہو چکی ہیں۔ لیکن اس مسلسل تگ ودو کے باوجود علمائے اہل سنت کے روایتی جمود کو توڑنے میں ہم ابھی کامیاب نہیں ہو پا رہے ہیں۔ لیکن مایوسی نہیں ہے امیدوں کے چراغ جلائے ہوئے ملی مسائل کے شہرِ خموشاں میں ہم زندگی تلاش کر رہے ہیں۔

انھیں احساسات کے پیشِ نظر امسال مارہرہ مطہرہ میں عرس قاسمی کے موقع پر فکر وتدبیر کانفرنس ہوئی۔ موضوع تھا «قومی وملی مسائل میں اہل سنت کی نمائندگی-امکانات اور طریقۂ کار» صاحب سجادہ حضرت امین ملت سید محمد امین میاں برکاتی کی سرپرستی اور شرف ملت حضرت سید محمد اشرف میاں برکاتی کی قیادت میں یہ کانفرنس خطابات وتاثرات کی حد تک یقیناً بہت کامیاب رہی۔ علما اور دانش وروں کے احساسات قریب قریب یکساں تھے۔ قومی وملی مسائل کے تعلق سے کچھ کر گزرنے کا حوصلہ بھی نظر آیا اور ہمیں امید ہے کہ خانقاہِ برکاتیہ اپنی روایت کے مطابق اس سمت میں بھی مستحکم اور شعوری سفر کا آغاز کرے گی۔ انشاء اللہ قومی بساط پر بھی فکر وعمل کا سورج طلوع ہوگا۔ کانفرنس کے بعد بہ اتفاقِ رائے حسب ذیل تجاویز منظور ہوئیں جنھیں اپنے اکابر کے حکم سے راقم نے اجلاسِ عام میں پڑھ کر سنایا اور ہزاروں ہزار کے مجمع نے ان تجاویز کی جذباتی انداز سے حمایت کی۔ تجاویز کا متن ذیل میں ملاحظہ فرمائیے:

(۱) قومی وملی مسائل میں اہل سنت کی نمائندگی حالات کا جبری تقاضا ہے، لہٰذا علما اور مشائخ کو چاہیے کہ وہ اس موضوع پر اپنا مشترکہ لائحۂ عمل طے کریں۔

(۲) چند افراد پر مشتمل ایک ایسا گروپ وجود میں آئے جو قومی وملی مسائل کے حوالے سے اپنے فکر وتدبر کی روشنی میں قوم وملت کی رہ نمائی کرے۔

(۳) اجلاس میں ایک ایسی تنظیم کی تشکیل پر بھی زور دیا گیا جو مسلسل ملی مسائل پر عملی پیش قدمی کرتی رہے۔

(۴) ایک ایسے میڈیا سینٹر کی ضرورت وقیام پر بھی توجہ مبذول کرائی گئی جو اہل سنت کے موقف کو حکومت وعوام تک پہنچا سکے۔

(۵) اہل سنت وجماعت کی تنظیموں اور افراد کو ملک میں رفاہی اور فلاحی معاملات کے لیے مستعد رہنا چاہیے اور آفات وفسادات کے مواقع پر پریشان حال افراد کی ہر ممکن مدد کرنی چاہیے۔

(۶) ایک ایسی کمیٹی تشکیل دی جائے جو قانونی معاملات میں مسلمانوں کی مدد اور رہ نمائی کرے۔

(۷) بابری مسجد کے تعلق سے ہائی کورٹ کے فیصلے پر عدم اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے یہ طے پایا کہ اس معاملے کو سپریم کورٹ میں لے جانے کی ہم تائید کرتے ہیں اور اگر قانون اجازت دیتا ہے تو بہ حیثیت فریق ہم اہل سنت بھی پیش قدمی کرنے کے لیے تیار ہیں۔

(۸) قومی وملی مسائل میں ہماری نمائندگی کا کیا طریقۂ کار ہو، اس پر غور وفکر کرنے کے لیے انشاء اللہ جلد ہی حضرت امین ملت دامت برکاتہم العالیہ کی قیادت میں ایک مشاورتی اجلاس کا انعقاد کیا جائے گا۔

اسلامی حدود وقصاص

بائبل اور عقل سلیم کی روشنی میں

عنبر مصباحی

آج کے روشن خیالی اور قدامت دشمنی کے ماڈرن سیلاب میں انسان اور انسانیت کی حفاظت وبقا کافی مشکل ترین امر بنتا جارہا ہے۔ جدت پسندی کی آندھیاں ہزاروں سالوں سے قائم اور جھولتے درختوں کی جڑ وبیخ اکھاڑنے میں لگی ہوئی ہیں۔ قدیم اصول وقوانین کوفرسودہ اور لغوقرار دینے کی ایک مسابقت چل پڑی ہے۔ عمدہ سے عمدہ اور متفق علیہ امور کوفرسودہ اور ریٹائرڈ قرار دے کران کے نام زبردستی پینشن جاری کیا جارہا ہے۔ فلاح وکامرانی کے ضامن افکار ونظریات اور کامیاب طرزِ معاشرت کوبھی بنیاد پرستی کا لیبل لگا کر باعث ننگ وعار قرار دیا جارہا ہے۔ تخلیق جہاں کے وقت سے چلے آرہے حیات وزیست کے جامع اخلاق وکردار صرف اس لئے بزم دانش سے نکالے جارہے ہیں کہ وہ کسی ملحد وبے دین سائنس داں کی ''منفرد عقل'' کے خلاف ہے۔ اور یہ سب بھی اسی جمہوریت کے دورعروج میں ہورہا ہے جو اکثریت کی رائے اوران کے خیالات کی حکومت کی قائل ہے۔ آزادیٔ رائے اور حقوق کی آزادی کے نعرے اتنی شدت سے بلند کئے جارہے ہیں کہ انسان تمام دیرینہ اخلاقی اور معاشرتی زنجیروں کواپنے لئے قیدوبند سمجھ کرانہیں توڑنے پہ کمربستہ اور مجبور کردیا جارہا ہے۔ نوبت ایں جارسید کہ ایک روشن خیال باپ نے اپنے ماڈرن بیٹے کوکسی امر ناگوار پہ سرزنش کی تواس نے کہا:

ڈیڈ! زیادہ جمانے کانہیں۔ یہ اکیسویں صدی ہے۔ آزادی کا دور ہے۔ ڈیڈی اور ممی کے آخر سے ''ی'' ختم کرکے اکیسویں صدی کے والدین کویہ پیغام دیا گیا ہے کہ ''ی'' کے ساتھ ان کے اختیارات بھی ختم کردئے گئے ہیں''۔

یہ ماڈرن ایج کی جدت پسندی اور روشن خیالی ہے کہ اب ہر چیز نئی لاؤ۔ اور ایک درزی کے بقول: ''پھٹا پینٹ پہننا فیشن اور نیو اسٹائل ہے جب کہ بے پھٹا پہننا قدامت پسندی''

اور اب تو وہ افکار ونظریات جن پرانسانیت کی بقاموقوف ومرکوز ہے وہ بے چارے بھی اکیسویں صدی کے ان اعلیٰ دماغ اور روشن خیالوں کے روشن خیالی کے نشتر سے مجروح ہوتے جارہے ہیں۔ جسم فروشی جس کے ایک قبیح اور ناقابلِ قبول فعل ہونے پہ دنیا ہزاروں سال سے بلاتفریق ملک ومذہب متفق رہی ہے آج اسے آزادی اور روشن خیالی کے نئے کلیہ سے قانونی جواز (Legalization) مہیا کیا جارہا ہے۔ صرف اسلام ہی نہیں دنیا کے تمام مذاہب سمیت ہرانسان نے حفظ جان کی حکمت کومدنظر رکھتے ہوئے قتل وجراحت کی سزا ''قصاص'' متعین کیا ہے۔ اس کائنات کے پھولوں کی خوشبوؤں کوسونگھنے والے، کانٹوں پہ چلنے والے، ہواؤں کو چیر کر مہینوں کاسفر پل بھر میں طے کرنے والے، چاند وسورج کی شعاعوں کوسائنس کی زنجیروں میں جکڑ کرانسانوں کے لئے کارآمد بنانے والے، ماہتاب پہ کمندیں ڈالنے والے، فضاؤں کومسخر کرنے والے، پہاڑوں اور چٹانوں کوبسیرا بنانے والے، درختوں کی پتیوں کو بطور غذا اور لباس کام میں لانے والے، زرق برق اور شاہی لباس پہننے والے اوراس خاکدانِ گیتی کے ذرے ذرے کی سیاحت کرنے والے جمیع انسان ''جیسا جرم ویسی سزا'' کے اصول پہ آدم تا ایں دم متفق رہے۔ یہی وجہ ہے کہ تقریباً دنیا کی ہر زبان میں ''جیسی کرنی ویسی بھرنی''، ''Tit For Tat'' اور ''کَمَا تَدِیْنُ تُدَانُ'' کے محاورات مستعمل ہیں۔ مگر اب نیا دور، نئی امنگیں، نئے محبوب (ہم جنس)، نئی منزلیں اور نئے مقاصد کا دور دورہ ہے۔ جب تک دنیا کم ترقی یافتہ اور ''نیم جاہل نیم عالم'' رہی اس کے دانشور اور اعلیٰ دماغ سمجھے جانے والوں نے ''جیسی کرنی ویسی بھرنی'' کوملکی آئین ودستور کا اہم جز مانا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ دنیا امن ومحبت، سلم وسلامتی اور امن وسکون سے بھری مختصر سی جنت نظر آتی تھی۔ مگر جب سے ترقی نے برق سے رفتار مستعار لی ہے اور علم وسائنس کی روشنی تیز ہوگئی ہے تب سے اسلاف بیزاری اور آباواجداد کی ''تحمیق'' کا طوفان بھی تیزتر ہوگیا ہے۔ نئے دور کے زیادہ علم والے اور ڈھیر ساری ترقی یافتہ انسانوں نے قصاص اور سزائے موت کوفرسودہ اور دور جہالت

(The TIme Of Ignorance) کی علامت بتا کر ختم ہی کردیا۔ نتیجۃً دنیا میں تقریباً پانچ ہزار سے زیادہ افراد یومیہ قتل کردیے جاتے ہیں۔ اور یہ دنیا ترقی کی معراج کے باوجود ظلم وستم، حقوق تلفی، دل آزاری، ناانصافی وبے ایمانی اور چوری ڈکیتی کی آماجگاہ بنتی جارہی ہے اور آج آدم کی اولادیں اسی سرزمیں پہ جہنم بسانا چاہتی ہیں۔

اسلام میں حکم قصاص وحدود

سب سے پہلے میں ایک امر کی وضاحت کردینا مناسب سمجھتا ہوں کہ میری تحریریں اور نگارشات غیر جانبداری اور معروضی مطالعہ پہ مبنی ہوتی ہیں۔ اس کے باوجود اگر کوئی روشن خیال مسلم یا غیر مسلم مجھے صرف اس لیے تعصب کاالزام دے کہ میں نے معروضی مطالعہ کے وقت ''اسلامی عقائد'' اور شریعت اسلامیہ کے ناقابل تبدیل اور اٹل افکار ونظریات سے اپنے ذہن وفکر کوخالی نہیں کیا تو وہ مجھے شوق سے ایک ''متعصب نثر نگار'' یا ایک ''جانبدار عالم'' کہہ سکتے ہیں۔ کیوں کہ اگران کے نزدیک مذہبی قیود وحدود اوراس کے معتقدات سے آزاد ہوکر تحقیق اور ریسرچ کرنے کوہی معروضی مطالعہ یا غیر جانبدارانہ تحقیق کہتے ہیں تو یہ ''الحادی تحقیق'' ان جیسے محققین کوہی مبارک ہو! ہم ایک لمحے کے لیے بھی اپنے دل سے اسلامی معتقدات اور قرآنی پیغامات کوالگ کرہی نہیں سکتے ہیں۔ ہم تو اسلام کے وہ خادم اور سپاہی ہیں جنہوں نے عصر حاضر کی تلوار ''قلم وقرطاس'' کوہی اپنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اور اسی سے اشاعتِ اسلام مقصود اور تبلیغِ دین مطلوب ہے۔

اسلام نے نسل انسانی اوراس کے اعضا وجوارح کی حفاظت کے عظیم مقصد کوپیش نظر رکھتے ہوئے ان پر کی جانے والی زیادتیوں کی سزا ''قصاص'' یعنی اسی کی مثل کو متعین کیا اور قرار دیا ہے۔ اللہ رب العزت ارشاد فرماتا ہے:

''یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی''۔

اے مومنو! تم پر مقتولوں کے معاملے میں مثل کوواجب کیا گیا''۔ (سورۃ البقرۃ: ۱۷۸)

اوراس کی حکمتوں کوبیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

''وَلَکُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوۃٌ یّٰاُولِی الْاَلْبَابِ''

اے دانش مندو! تمہارے لئے (قتل وجراحات کے معاملے میں) قصاص میں ہی زندگی ہے''۔ (سورۃ البقرۃ: ۱۷۹)

لیکن سطح بینوں کوحکم قصاص ایک جابرانہ وظالمانہ اور حقوقِ انسانی مخالف قانون نظر آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''موت میں حیات'' یہ کیسے ہوسکتا ہے......؟؟ مگر دانشوری کے سمندر کی غوطہ زنی کرکے صدف نکالنے والے اوران موتیوں کی چمک سے ساری دنیا کی عقلوں کوخیرہ کردینے والے علمائے اسلام اور مفسرینِ کرام ارشاد فرماتے ہیں:

''قصاص'' کے وجود سے ہی نوعِ انساں کی حفاظت وصیانت مربوط ہے۔ کیوں کہ جب کسی شخص کواس امر کاخوف ہوگا کہ کسی دوسرے کی جان لینے کے عوض اسے بھی قتل کیا جائے گا۔ کسی شخص آخر کے ہاتھ، پاؤں، کان، ناک، آنکھ وغیرہ اعضا کوضائع کرنے کی سزا میں اسے بھی ان ہی دردناک سزاؤں کا سامنا بہرحال کرنا ہوگا تو وہ جوش وجذبات کی روانی میں بے حس تنکے کی طرح بہنے سے قبل سینکڑوں اور ہزاروں مرتبہ ''ترکہ سلیمانی'' کواستعمال کرے گا۔ اور کوئی بھی زندہ عقل اسے جلد مشتعل ہونے نہیں دے گی۔ اوراس طرح قتل وغارت گری، خدا کی حسین مخلوق کے چہرے پہ تیزاب ڈالنے اور عضو انسانی کوقطع وبرید کرنے کا معاملہ کم ہی نہیں بلکہ ''نہیں'' کی حد تک پہونچ جائے گا اور روئے زمین انسانی خون سے سیرابی کے باعث بنجر اور ناقابل کاشت ہونے سے محفوظ ہوجائے گی۔ مگراس کے برخلاف اگر ''قصاص'' کا حکم نہ ہو اور سرکشی پہ آمادہ شخص کویہ معلوم ہوکہ وہ دوسرے انسان کی جان لینے کے بعد بھی گلشنِ زیست کی معطر کلیاں (اگرچہ ہلکی خاردار ہی ہوں) چن سکے گا اور ''ماڈرن انصاف'' اس کی زندگی کا ضامن ہوگا تو پھر اسے معمولی اور باتوں پہ بھی اپنے ہم نوعوں کوقتل کرنے اور اشتعال کے جذبات میں جھلس کر دوسروں کوآگ میں ڈالنے سے کوئی نہیں روک سکے گا کیوں روکنے والا صرف قانون ہوتا ہے اور وہ بے چارہ تواب بوڑھا ہوکر وظیفہ خواری کی زندگی گذارنے یورپ جاچکا ہے۔

اسی طرح اسلام نے حفظِ نسل کی خاطر محصن اور محصنہ (شادی شدہ مرد وعورت) کوزنا کی پاداش میں رجم کرنے کا حکم دیا ہے:

''اَلشَّیْخُ وَالشَّیْخَۃُ اِذَا زَنَیَا فَارْجُمُوْهُمَا نَکَالًا مِّنَ اللّٰهِ''

شادی شدہ مرد وعورت اگر زنا کریں توانہیں سنگسار کرو یہ سزا (دیگر انسانوں کے لیے) اللہ کی جانب سے عبرت اور عقال ہوگی''۔

تاکہ بدکاری کا بازار بند رہے تو نسلِ انسانی کی صیانت اور مہذب معاشرے کی تشکیل آسان وسہل تر ہوسکے۔ اسی کے مثل قرآن حکیم نے ملک اور شہریوں کی حفاظت کی خاطر ڈاکوؤں کے قتل اور چوروں کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا ہے جو عقل انسانی (اور خود بائبل کی

روسے درست ہے۔جیسا کہ آگے آرہا ہے) کے عین مطابق ہے کیوں کہ نا قابلِ برداشت سزاؤں کا تصور اور اس کا ہمہ وقت خیال ہی مباشرتِ جرم سے روکنے کا سب سے اہم اور مؤثر ہتھیار ہے۔عبرت ناک سزاؤں کو دیکھ لینے کے بعد کوئی بھی ان چیزوں کی طرف اضطرار کے بغیر ہرگز مائل نہ ہوگا (جیسا کہ آگے خود بائبل کے الفاظ میں آرہا ہے۔) برخلاف اس کے اگر قانون ''تارِ عنکبوت'' سے بنایا گیا ہو یا اس کی گرفت ڈھیلی ہو تو پھر ''لاقانونیت'' کا ہی قانون چلے گا اور انہیں کے متحدہ الائنس کو اقتدار کی زریں کرسی نصیب ہوگی جیسے آج کل کے ''ماڈرن اور ترقی یافتہ دور'' میں ہو رہا ہے کہ عملاً صدر اور وزیر اعظم سے زیادہ اختیارات ''لاقانونیت'' اور ان کے رضاعی ماں باپ (جرائم پیشہ سیاست دانوں) کو حاصل ہیں۔

اسلامی حدود وقصاص بائبل کی نظر میں

روشن خیالی ،اسلاف بیزاری اور جدت پسندی کی مسموم ہواؤں سے سارے جہاں کے موسم کی بہاروں کو جلا کر ''نمرودی خزاں'' کے ''نادر جلوے'' دکھانے والی اور قصاص کی وجہ سے (صرف قصاص ہی نہیں بلکہ اس کے علاوہ اور بہت سی چیزوں میں اسلام کی بے جا مخالفت میں دن ورات کے چین وسکون ختم کر دینے والی اور) اسلام پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم، قرآن وحدیث اور اللہ عزوجل کی ''احمقانہ دشمنی'' خرید کر بلا عوض ''فروخت'' کرنے والی قوم عیسائیوں کی کتاب مقدس بائبل بھی ''حکم قصاص وسزائے موت'' سمیت دیگر حدود میں اسلام اور شریعتِ اسلامیہ کی موافقت کرتی اور عالمگیر آفاقی پیغام قرآن حکیم کے شانہ بشانہ اور اس کے قدم سے قدم ملا کر چلتی ہوئی نظر آتی ہے۔

عضو کا قصاص عضو اور جلانے کا قصاص جلانا ہے

قصاص کے متعلق بائبل میں معزز نبی موسیٰ علیہ السلام کا قولِ صادق (بائبل میں تین طرح کی آیات ہیں۔[1] جن کے بطلان میں کوئی شبہ نہیں جیسے ہارون علیہ السلام کی طرف بت پرستی اور لوط علیہ السلام کی طرف اپنی بیٹیوں سے بدکاری کی نسبت ،معاذ اللہ، صد معاذ اللہ![2] جن کے حق ہونے میں کوئی ریب نہیں جیسے فرعون سے نجات اور اس کے لشکر سمیت ڈوبنے کا واقعہ۔[3] جن کی حقانیت وبطلان کے متعلق سکوت ہی اولیٰ ومناسب ہے جیسے حضرت سلیمان علیہ وعلی نبینا الصلوٰۃ والسلام کے ازواج کی تعداد) ان الفاظ میں مذکور ہے:

The payment will be life for life, eye for eye, tooth for tooth, head for head, foot for foot, burn for burn, cut for cut, and bruise for bruise.(Exodus 21/25, published by American Bible Society New york)

جان کے بدلے جان ،آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت، ہاتھ کے بدلے ہاتھ، پاؤں کے بدلے پاؤں، کاٹنے کے بدلے کاٹنا، زخم کے بدلے زخم اور جلانے کا قصاص جلانا۔کیا بائبل کی یہ آیت قرآن حکیم کے مندرجہ ذیل آیت کا ترجمہ نہیں ہے؟

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ، وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ، وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ، وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ، وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ، وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ.

''ہم نے بنی اسرائیل پہ تورات میں یہ بات فرض کی ہے کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور زخموں کے قصاص بھی انہیں کے مثل ہیں'' (یہ احکام اسلام میں بھی باقی ہیں)۔(سورۃ المائدۃ:۴۵)

جب بائبل اور قرآن میں حدود وقصاص یکساں ہیں تو پھر کس طرح قرآن دہشت گردی کا داعی اور بائبل امن کا پیامبر بن گیا؟؟

بائبل پہ ایمان رکھنے والے ذرا یہ بتائیں کہ انسانوں کو جلانا کیسا ہے؟ کیا یہ حقوقِ انسانی کی محافظت ہے؟ ایک طرف انصاف پسندی اور روشن خیالی کا نعرہ لگا کر غریب اور پسماندہ ممالک سمیت ترقی پذیر سلطنتوں کو بھی ذہنی اور معاشی غلام بنانے کی تگ ودو میں رہتے ہیں اور دوسری طرف اسی بائبل کا ترجمہ دنیا کی ہر زبان میں کروا کے مفت اور رعایتی قیمتوں میں تقسیم کیا جاتا اور اسے نجات دہندہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے جس میں یہ وحشیانہ احکام ہیں۔یہ دوغلی پالیسی کب تک؟

کیا بائبل کی طرح قرآن حکیم میں بھی آدم کی اولاد کو زندہ یا مردہ جلانے کا حکم ہے؟

ماں اور بیٹی اگر ایک ہی مرد سے شادی کریں تو تینوں سنگسار کیے جائیں

اگر کسی شخص نے ایک عورت اور اس کی بیٹی دونوں سے نکاح کر لیا تو اس کی سزا بائبل میں ان الفاظ میں مذکور ہے:

It is not natural for a man to marry both a

mother & her daughter, and so all three of them will be burnt to death.(Leviticus 20/14, Published by ABS New york)

یہ فطرت کے خلاف ہے کہ کوئی شخص ایک عورت اور اس کی بیٹی دونوں سے نکاح کرے، (اگر ایسا ہوتا ہے تو) ان تینوں کو مرنے تک آگ میں ڈالے رکھو''۔

اسلام نے بھی ایسی شادی کو حرام قرار دیا ہے۔اللہ عزوجل کا واضح ارشاد ہے: ''وَرَبَائِبُكُمُ الَّتِي فِي حُجُورِكُمْ''

اور تم پہ تمہاری بیویوں کی بیٹیاں حرام ہیں۔(سورۃ النسا:۲۳)

لیکن اسلام نے ایسے شخص کے لیے جلانے جیسا سنگدلانہ اور ''دہشت گردانہ'' حکم نہیں دیا ہے۔

زنا کی سزا قتل

اور زانیوں کی سزا کا ذکر کرتے ہوئے موسیٰ علیہ السلام سرکش قوم بنی اسرائیل کو حکمِ خدا سناتے ہیں:

Take them both to town gate & stone them to death you must get rid of the evil they brought into your community.(Deuteronomy 22/24, Published by ABS New York)

زنا کرنے والے مرد وعورت کو شہر کے دروازے پہ لا کر پتھر مارتے رہو یہاں تک وہ مر جائیں، تم اسی طرح اپنی سوسائٹی سے اس غلاظت کو دور کرو جو ان دونوں کی وجہ سے در آئی ہے۔

کیا یہ اسلام کے مندرجہ ذیل حکم کے ہم معنیٰ نہیں ہے؟

''اَلشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ إِذَا زَنَيَا فَارْجُمُوهُمَا نَكَالًا مِنَ اللّٰهِ''۔

جب شادی شدہ مرد وعورت زنا کریں تو انہیں سنگسار کرو، یہ سزا اللہ کی جانب سے (دوسروں کے لیے) عبرت ہے''۔

زنا کی سزا آگ

بائبل میں زنا کی ایک عجیب وغریب سزا کا بھی ذکر ملتا ہے۔

بنی اسرائیل کے بادشاہ وپیغمبر یہوداہ کو یہ خبر دی گئی کہ:

Your daughter in law Tamar has behaved like a prostitute & now she is pregnant, "Drag her out of town & burn her to death" Judha shouted.(Genesis 38/24, Published by ABS New York)

تمہاری بہو نے طوائف سا کام کیا ہے اور اب وہ حاملہ ہے، یہ سن کر یہوداہ انتہائی غصے میں چیخ پڑے: ''اسے شہر کے باہر لے جاؤ اور جلا کر خاکستر کر دو''۔(یہ اور بات ہے کہ وہ حمل اسی ''مقدس اور پاکباز'' کا تھا۔سفر التکوین: ۱۸ /۳۸۔۳۰،بائبل کا اردو ترجمہ بنام ''کتاب مقدس'' مطبوعہ دی بائبل سوسائٹی آف انڈیا، بنگلور۔)

اسلام نے صرف زانیوں کے لیے یہ حکم دیا کہ:

''اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ''

زنا کرنے والے مرد وعورت کو سو سو کوڑے لگائے جائیں''۔

(سورۃ النور:۲)

تو اس پر ساری دنیائے عیسائیت چیخ پڑی کہ انسانوں کو کوڑے لگانا انسانیت کے خلاف اور ایک بہیمانہ اقدام ہے مگر یہاں ایک زندہ اور حاملہ عورت کو جلانے کا حکم دیا گیا مگر پھر بھی انسانیت پہ آنچ نہیں آئی۔علاوہ ازیں قصور اور گناہ اس زانیہ عورت کا ہے نہ کہ اس کے پیٹ میں پل رہے اس ننھی سی کلی کا جس نے دنیا دیکھا ہی نہیں۔ جسے یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ نیکی وبدی کیا ہوتی ہے۔پھر آخر اس بچے کا کیا قصور ہے جو اسے کائنات اور اس کے ظالم وشقی باشندوں کو دیکھنے سے قبل ہی آتش نمرود کے حوالے کیا جا رہا ہے؟ کیا یہی انسانیت ہے؟ کیا یہی انسانی حقوق کی حفاظت ہے؟

ایک طرف بائبل کے اس اقتباس کو ذہن میں رکھیے اور دوسری طرف احادیث وسیر کی کتابوں میں محفوظ اس واقعہ کو مدنظر رکھیے اور پھر اپنے زندہ ضمیر پہ ہاتھ رکھ کر پوچھیے کہ حقوق انسانی کا محافظ کون ہے:

امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بارگاہ میں ایک زانیہ عورت پیش ہوئی ۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ اس سے زنا کا صدور ہوا ہے تو امیر المؤمنین نے اسے سنگسار کرنے کا حکم دیا۔ امیر المؤمنین کے ذریعے رجم کا حکم سنا دئے جانے کے بعد حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس عورت کو مجلس سے الگ لے گئے اور اس سے کچھ گفتگو کی۔واپس آئے اور حضرت عمر سے کہا: امیر المؤمنین! اس عورت کی سنگساری کی سزا کچھ مہینوں کے لیے موخر کر دی جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سبب دریافت کیا تو علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے جواب دیا: یہ عورت حاملہ ہے۔اور چوں کہ گناہ اس سے سرزد ہوا ہے نہ کہ اس کے جنین سے لہٰذا سزا کو موخر کر دیا جائے تا کہ سزا صرف اسی کو ملے اور وہ جنین اس سے محفوظ رہے۔ یہ سن کر حضرت عمر نے جو جواب دیا وہ حقوق انسانی کے محافظوں کے

لیے ایک مشعل راہ ہے جس کی روشنی میں انہیں ہدایت ہی ملے گی:

"لولا علی لهلك عمر"۔

آج اگر علی نہ ہوتے تو (ایک بے قصور کو قتل کرا کے) عمر ہلاک ہو جاتے"۔

کیا ان تمام امور کے ہوتے ہوئے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اسلام کے حدود و تعزیرات انسانیت شکن اور حقوق بشری مخالف ہیں......؟؟

والدین کی نافرمانی کی سزا سنگساری

اور بار بار تنبیہ کے باوجود نافرمانی و سرکشی سے باز نہ آنے والے بیٹوں کے متعلق بائبل نے موسیٰ علیہ السلام کی زبانی حکمِ الٰہی کو ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

The men of the town will stone that son to death.(Deuteronomy 21/21, Published by ABS New York)

اہلیانِ شہر اس سرکش بیٹے کو پتھروں سے مار مار کر قتل کر دیں"۔

اغوا کی سزا قتل

اور اغوا کاروں کی حد کا ذکر کرتے ہوئے بیان فرمایا:

If you are guilty of kidnaping Israelites & forcing them into slavery you will be put to death to remove this evil from the community.(Deuteronomy 24/7, Exodus 21/16, Published by ABS New York)

اگر تم اسرائیل کے کسی فرد کے اغوا یا انہیں غلام بنانے کے جرم میں ملوث پائے گئے تو تم قتل کر دیئے جاؤ گے تا کہ اس برائی سے معاشرہ کی صفائی ہو سکے"۔

مجرموں کی سزا صرف قتل ہے

جرائم پیشہ افراد کے لیے موسیٰ علیہ السلام کی زبانی یہ پیغام دیا گیا:

If a crimnal put to death, and you hang the dead body on a tree, you must not let it hang tree overnight bury it same day because the dead body of a crimnal will bring god's curse on the land.(Deuteronomy 21/22,23 Published by ABS New York)

کرمنلوں کو سزائے موت دینے کے بعد ان کی لاشوں کو پوری رات درخت پہ جھولتے ہوئے نہ چھوڑو بلکہ ان کی لاشوں کو اسی دن دفن کر دو، کیوں کہ ان گناہ گاروں کی نعشوں کے سبب زمین پر عذابِ الٰہی نازل ہوتا ہے"۔

غلطی کسی کی سزا کسی کو

قرآن حکیم فرماتا ہے: "لَہَا مَا کَسَبَتْ وَعَلَیْہَا مَا اکْتَسَبَتْ"

ہر آدمی کو سزا و جزا اس کے اپنے اعمال کی بنیاد پر دی جائے گی۔(سورۃ البقرۃ:۲۸۶)

مگر بائبل کی دنیا میں سیر کرنے والوں کو ایک عجب خاردار اور "آدم خور قانون" نظر آتا ہے۔ بنی اسرائیل کو مخاطب کرتے ہوئے ان کا "خدا" فرماتا ہے:

If you reject me I will punish your families for three or four generation.(Exodus 20/5, 34/7 Publishedby ABS New york)

اگر تم میرا انکار کرو گے تو میں تمہارے خاندان اور گھر والوں کو تین یا چار نسلوں تک سزا دیتا رہوں گا"۔

غلطی کسی کی اور سزا کسی اور کو۔ شاید کسی شاعر نے اسی طرح کے انصاف کو دیکھ کر درج ذیل مصرعہ کہا تھا:

ع لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی

سبت کا احترام نہ کرنے کی سزا قتل

بنی اسرائیل کے لیے سبت کا دن نہایت معزز و مکرم تھا۔ وہ دن اتنا محترم تھا کہ اس دن مریضوں کا علاج کرنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ عیسیٰ علیہ السلام پہ یہودی ربیوں کے الزامات میں سے ایک الزام یہ بھی تھا کہ وہ سبت کی عظمت کو توڑتے ہوئے سبت کے روز بھی لوگوں کو شفا رسانی کا کام انجام دیتے ہیں۔ جب سبت کا معاملہ اتنا سخت تو یقیناً اس کی سزا بھی اتنی ہی شدید ہوگی۔ ایک مرتبہ ایک "بے چارہ" سبت کے دن جنگل میں لکڑیاں چنتے ہوئے دیکھا گیا۔ اب آگے کی کہانی خود بائبل کی زبانی ملاحظہ فرمائیں:

He was taken to Moses, Aron and the rest af the community. but no one knew what to do with him so he was not allowed to leave, then the Lord said to Moses: tell the people to take that man outside the camp & stone him to death. so he was killed just as the Lord had

commanded Moses.(Numbers 15/32-36)

اس شخص کو پکڑ کر موسیٰ، ہارون علیہما السلام اور قوم کے بقیہ افراد کی طرف لے جایا گیا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کس طرح کا سلوک کیا جائے اسی لیے اسے مقدس جگہ میں رہنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ کچھ دیر بعد خدا نے موسیٰ علیہ السلام کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اس شخص کو لے کر خیمہ کے باہر لے جاؤ اور اس پر پتھر برساتے رہو یہاں تک وہ ایں جہانی سے آں جہانی ہو جائے"۔

اس شخص نے صرف لکڑیاں چن لیں اور سبت کے دن اس کام سے باز نہ آیا تو اسے سنگسار کر دیا مگر پھر بھی انسانیت شرمسار نہ ہوئی۔ حقوق انسانی کی حفاظتی دیوار منہدم نہ ہوئی جب کہ اس کے اس عمل سے کسی کی بھی جان و مال یا عزت آبرو کو کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچا مگر اسلام نے حفظ نسل، حفظ مال، حفظ نفس اور صیانت آبرو کے لیے قاتلوں، چوروں، قزاقوں اور زانیوں کے لیے مختلف قسم کی سزائیں مقرر کر دیں تو ان سے حقوق بشری کی پامالی ہو گئی۔ یہ دوہرا معیار کب تک......؟

سزاؤں کی حکمتیں

اور ان تمام سزاؤں کی حکمت و علت بیان کرتے ہوئے کہا گیا:

Because they must get rid for evil he brought into the community, everyone in Israel will be afaird when they hear how he was punished. (Deuteronomy 21/21, Published by ABS New York)

کیوں کہ انہوں نے ان برائیوں کے سبب سماج میں کافی پراگندگی پھیلائی ہے، (تو اس کی تطہیر کا کام بھی انہیں کے خون سے انجام دیا جائے) تا کہ یہ خبر سن کر اور ان کا حشر دیکھ کر تمام اسرائیلی (ان برائیوں کے ارتکاب سے) خوف کھانے لگے"۔

کیا بائبل کا یہ اقتباس قرآن حکیم کی اس آیت کا مفہوم نہیں ہے:

"وَلَکُمْ فِی الْقِصَاصِ حیوۃ یَّاُولِی الْاَلْبَابِ"

اے دانشمندو! تمہارے لئے قصاص میں ہی زندگی ہے"۔
(سورۃ البقرۃ:۱۷۹)

اسلامی حدود و قصاص عقل سلیم کی نظر میں

ساحل پہ بیٹھ کر اور ظاہر نظر سے دیکھا جائے تو حدود و عقوبات عقل مخالف اور ہوش و خرد سے بیگانگی پہ دال محسوس ہوتے ہیں۔ مرنے والا مر چکا ہے اب اس کے بدلے میں قاتل کو قتل کر دیا جائے یا اسے دس بیس سال کے لیے قید خانے میں ڈال دیا جائے تو بھی وہ زندہ نہیں ہو سکے گا۔ اب ایسے میں ایک انسان کو بلا وجہ قتل کرنا کہاں کی دانش مندی ہے......؟؟ مگر جب دانشمندی کے سمندر میں اتر کر غور کیا جائے تو یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ سطح ساحل سے جو بے کار شے نظر آتی تھی وہ حقیقت میں سیپ ہے جس میں حفاظت انسانی کے قیمتی موتی پنہاں ہیں۔ اگر قتل و جراحات کی سزائیں نہ ہوں اور شرارت پسندوں کو لوگوں کی عزت و آبرو اور ان کی جان و مال سے کھیلنے کی چھوٹ دے دی جائے تو پھر دنیا سے شرافت اور شریف ناپید ہو جائیں گے۔ اور یہ دنیا صرف امن مخالفوں کا آشیانہ رہ جائے گا۔ آئین و قانون اور صدق و امانت اور انسانیت و آدمیت نام کی ہر چیز کا نام و نشان مٹ جائے گا۔ اور اگر جرم کی سزا شدید ترین ہو تو نظام حکومت بھی چست ہوگا اور ہر طرف امن امان کا ہی دور دورہ ہوگا۔

۲۰۰۲ء میں لال کرشن اڈوانی جب ہندوستان کے وزیر داخلہ اور نائب وزیر اعظم دونوں عہدوں پر براجمان تھے۔ اس وقت دہلی میں عصمت دری کا ایک سیلاب سا آ گیا۔ پورے ملک میں کافی ہنگامہ برپا تھا تو وزیر داخلہ مسٹر اڈوانی نے قرآنی حکمتوں کو سامنے رکھتے ہوئے خواتین کی عصمت پہ ڈاکہ ڈالنے والوں کے لیے حکومت سے "سزائے موت" کا قانون بنانے کی مانگ کی تھی۔

ہندوستان میں گذشتہ تین چار ماہ سے آنر کلنگ یعنی غیرت و حمیت کے نام پر قتل کا معاملہ کافی زوروں پہ ہے۔ سماجی غیرت کے نام پر آئے دن نوجوان جوڑوں کو نشانہ بنایا جا رہا اور ان کا قتل کیا جا رہا ہے۔ ماہ اپریل ۲۰۱۰ء میں پہلے آنر کلنگ معاملے میں سنوائی کرتے ہوئے ہریانہ کی ایک ذیلی عدالت نے مجرموں کو موت کی سزا سناتے ہوئے یہ تبصرہ کیا:

اس طرح کے واقعات کو روکنے اور انسانی جانوں کی حفاظت کے لیے اسی طرح کی سخت سزائیں کار آمد ہو سکتی ہیں ورنہ ہمارے سماج کے شر پسند عناصر مزید بے لگام ہو کر معاشرے اور ملک کا سارا سکون غارت کر دیں گے اور قومی نظام درہم برہم کر دیں گے۔

اسلامی آئین و قوانین اور حدود، حکمت، بائبل، عقل سلیم اور دانش وروں کے عین مطابق ہیں۔ "اَلْفَضْلُ مَا شَہِدَتْ بِہِ الْاَعْدَاءُ" فضل و کمال وہ ہے جس کی گواہی دشمن بھی دیں۔

قرآن پروردگارِ عالم کی ایک عظیم نعمت ہے جو حضورِ اکرم ﷺ کے وسیلہ سے بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے نازل ہوا۔ ہر دور میں انسان نے اس وسیع اور بسیط کتاب کی تشریح اور تفہیم اپنے علم کی روشنی میں کی ہے اور علم کے ارتقا کے ساتھ ساتھ اس کی قرآن فہمی کی صلاحیتوں میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ صدیوں تک قرآن کی تفسیر کرنے والے بعض آیات کی صریحاً توضیح کرنے سے قاصر رہے۔ بہت سی آیات ایسی ہیں جن کا ظاہری ترجمہ تو کیا جا سکتا ہے لیکن ان کی پوشیدہ حقیقتوں کا انسانی علم احاطہ نہیں کر سکتا۔ جدید علوم کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان حقائق کی کماحقہٗ ترجمانی میں آسانیاں ہوئی ہیں اور ظاہری معانی کے علاوہ پنہاں مقاصد بھی بڑی حد تک واضح ہوتے جا رہے ہیں۔

قرآن اور علوم جدید بالخصوص سائنس کے موضوع پر بحث کا دانش وروں کو موقع ملتا ہے۔ عام طور پر قرآن اور سائنس کے موضوع پر بحث کا رخ قرآنی ارشادات اور سائنسی ایجادات کے درمیان ہم آہنگی کی تلاش پر مرکوز رہتا ہے۔ اور اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ سائنسی ایجادات اور انکشافات کو قرآن کریم کی کسی نہ کسی پیشین گوئی پر منطبق کیا جائے۔ یہ بھی قرآن فہمی کا ایک رخ ہو سکتا ہے لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ قرآن اٹل حقیقتوں سے بحث کرتا ہے جب کہ سائنسی نظریات بدلتے رہتے ہیں۔

سطورِ ذیل میں قرآن عظیم کے بعض سائنسی پہلوؤں کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

سائنس بنیادی طور پر ایک انداز فکر ہے۔ محدود معنوں میں ہم سائنس سے فزکس، کیمسٹری، بیالوجی وغیرہ مراد لیتے ہیں لیکن آفاقی مفہوم میں سائنس کائنات کا علم ہے۔ سائنس لاطینی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی «جاننا» کے ہیں۔ پروفیسر کے لنگسر د کے مطابق سائنس نظامِ فطرت کے علم کا نام ہے جو مشاہدہ، تجربہ اور عقل سے حاصل ہوتا ہے۔ علم کے جس شعبے کو ہم سائنس کہتے ہیں اس کا دوسرا نام علم کائنات ہے جس میں انسان کا علم بھی شامل ہے۔ سائنس داں کائنات کے مشاہدے سے کچھ نتائج اخذ کرتا ہے اور ہر درست سائنسی نتیجے کو ہم مستقل علمی حقیقت یا قانون قدرت سمجھتے ہیں۔ مشاہدے اور تجربے سے دریافت ہونے والے علمی حقائق کو جب مرتب اور منظم کر لیا جاتا ہے تو اسے ہم سائنس کہتے ہیں۔

سائنسی رویہ انفرادی سوچ بچار، منطقی طرز فکر، شوق تجسس اور استدلالی صلاحیتوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ بعض معاشروں میں مروجہ عقائد، فطرتی شوق و تجسس اور دریافت طلبی کو برداشت نہیں کیا جا سکتا گلیلیو کی مثال سامنے ہے جس کو مروجہ عقائد کے خلاف نئے سائنسی انکشافات پیش کرنے پر موت کی سزا دی گئی۔ اس کے برعکس مسلمان سائنس دانوں نے قرآنی احکامات اور ارشادات کی روشنی میں بے مثال کامیابیاں حاصل کیں۔

بہ حیثیت کتاب قرآن کی بے شمار فضیلتیں ہیں۔ اس کے پڑھنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ دنیا کی اکثر زبانوں میں اس کا ترجمہ بھی ہوا ہے۔ بے شمار فن کاروں نے اس کی تزئین اور آرائش کی اور ایک سے ایک لاجواب شکل میں پیش کیا۔ اس کی ایک خاص فضیلت اس کے متن کی دائمیت اور ابد تک انسانیت کی رہ نمائی کرنا ہے۔ اس کے مطالب میں کشادگی اور بلندی کی ایسی صلاحیت موجود ہے کہ ہر دور کا انسان اس سے رہ نمائی حاصل کر سکتا ہے۔ دنیا میں موجود بے شمار تفسیریں اس بات کا ثبوت ہیں کہ کس طرح ہر دور کے انسان نے اس کے مفہوم کو اپنے علم کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ قرآن کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ یہ خدا کا کلام ہے اور اس کا موضوع

abooaltamash@gmail.com

بحث کائنات ہے۔ لہٰذا خدا کے قول اور فعل میں ہم آہنگی ضروری ہے۔ اگر ہم اپنے ناقص علم سے یہ ہم آہنگی تلاش نہیں کر سکتے تو یہ ہمارا قصور ہے۔ ہماری مروجہ تقسیم علوم کے حوالے سے یہ کسی خاص شعبۂ علم کی کتاب نہیں۔ اس کے باوجود اس میں تمام کائنات کا علم ہے۔ مختصراً یہ کہ اس میں وہ صداقتیں ہیں جن کی بنا پر یہ نظامِ کائنات چل رہا ہے۔ دوسرے وہ تاریخی اصول ہیں جن کے تحت قوموں کا عروج و زوال ہوتا ہے، اور تیسرے وہ اخلاقی ضابطے ہیں جن سے معاشرہ اور فرد کی زندگی سنورتی ہے اور جن کے ترک کرنے سے فساد واقع ہوتا ہے۔ قرآن کوئی سائنس کی درسی کتاب نہیں ہے اس کے باوجود اس میں مختلف سائنسی اشاروں، کنایوں اور اصولوں کا ذکر ہے جن کے ذریعہ قرآن فطرت کے بعض بنیادی اصولوں اور سائنسی حقیقتوں سے متعلق اپنے پڑھنے والوں کے لیے فکر کی راہ کھولتا ہے۔ قرآن کا مطالعہ کرتے وقت قاری کو مضامین اور موضوعات کے تنوع کی فراوانی پر حیرت ہوتی ہے مثلاً تخلیق کائنات، قوموں کا کردار، تمدنی اصول وغیرہ، لیکن ان تمام موضوعات کی غرض و غایت ایک دینی مقصد ہے، جس سے ایمان اور عقیدے میں پختگی پیدا ہوتی ہے۔ خدا کی قدرت کاملہ کے متعلق قرآن میں جو ارشادات ملتے ہیں انہیں پڑھ کر فکر انسان میں تخلیق کائنات پر غور اور فکر کرنے کی تحریک پیدا ہوتی ہے اور اس کی روشنی میں انسان کا ہر فعل قدرت کے منشا اور مرضی کے مطابق ہوتا ہے، یہی دین کی بنیادی غرض ہے۔ قرآن کا مطالعہ ہمیں جا بہ جا فطرت کا مشاہدہ کرنے اور عوامل فطرت پر تحقیق و جستجو کی مسلسل دعوت دیتا ہے۔ مثلاً:

وَهُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ وَاَنْهٰرًا وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیْهَا زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ [الرعد:۳]

[ترجمہ] اور وہی ہے جس نے زمین کو پھیلایا اور اس میں لنگر اور نہریں بنائیں، اور زمین میں ہر قسم کے پھل دو دو طرح کے بنائے رات سے دن کو چھپا لیتا ہے، بیشک اس میں نشانیاں ہیں دھیان کرنے والوں کو۔ [کنزالایمان]

وَاِنَّ لَكُمْ فِی الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِیْكُمْ مِّمَّا فِیْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَیْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِیْنَ [النحل:٦٦]

[ترجمہ] اور بے شک تمہارے لیے چوپایوں میں نگاہ حاصل ہونے کی جگہ ہے ہم تمہیں پلاتے ہیں اس چیز میں سے جو ان کے پیٹ میں ہے، گوبر اور خون کے بیچ میں سے خالص دودھ، گلے سے سہل اترتا پینے والوں کے لیے۔ [کنزالایمان]

وَكَاَیِّنْ مِّنْ اٰیَةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یَمُرُّوْنَ عَلَیْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ [یوسف:۱۰۵]

[ترجمہ] اور کتنی نشانیاں ہیں آسمانوں اور زمین میں کہ اکثر لوگ ان پر گزرتے ہیں اور ان سے بے خبر رہتے ہیں۔ [کنزالایمان]

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ [البقرۃ:۱٦٤]

[ترجمہ] بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات و دن کا بدلتے آنا اور کشتی کہ دریا میں لوگوں کے فائدے لے کر چلتی ہے اور وہ جو اللہ نے آسمان سے پانی اتار کر مردہ زمین کو اس سے جلا دیا اور زمین میں ہر قسم کے جانور پھیلائے اور ہواؤں کی گردش اور وہ بادل کہ آسمان و زمین کے بیچ میں حکم کا باندھا ہے ان سب میں عقل مندوں کے لیے ضرور نشانیاں ہیں۔ [کنزالایمان]

لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ [غافر:۵۷]

[ترجمہ] بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش آدمیوں کی پیدائش سے بہت بڑی لیکن بہت لوگ نہیں جانتے۔ [کنزالایمان]

امام ابن کثیر ایک واقعہ نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

بنی اسرائیل کے عابدوں میں سے ایک نے اپنی تیس سال کی مدتِ عبادت پوری کر لی تھی مگر جس طرح اور عابدوں پر تیس سال کی عبادت کے بعد ابر کا سایہ ہو جایا کرتا تھا اس پر نہ ہوا تو اس نے اپنی والدہ سے یہ حال بیان کیا۔ اس نے کہا بیٹے تم نے اپنی اس عبادت کے زمانہ میں کوئی گناہ کر لیا ہوگا، اس نے کہا اماں ایک بھی نہیں۔ کہا پھر کسی گناہ کا پورا قصد کیا ہوگا۔ جواب دیا کہ ایسا بھی مطلقاً نہیں ہوا۔ ماں نے کہا بہت ممکن ہے کہ تم نے آسمان کی طرف نظر کی ہو اور غور و تدبر کے بغیر ہی ہٹا لی ہو۔ عابد نے کہا کہ ایسا تو برابر ہوتا رہا۔ فرمایا بس یہی سبب ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے بھی لوگوں کو علم حاصل کرنے کا حکم دیا اور بڑی تاکید سے فرمایا کہ علم کا حصول ہمارے فرائض میں شامل

ہے۔آپ ﷺ کا فرمان مبارک ہے۔

وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ [مشکوٰۃ شریف جلد اول، حدیث نمبر ۲۱۸، کتاب العلم)

[ترجمہ] حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا۔علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

قرآن مجید میں ایک مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا [فاطر:۲۸]

[ترجمہ] اللہ سے اس کے بندوں میں وہی ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں۔[کنز الایمان]

چنانچہ سائنس ہمیں اس کائنات اور دیگر موجودات کے مطالعے کا ایک طریقہ بتاتی ہے۔اس سے ہمیں مخلوق کے وجود کی رعنائیوں اور خالق کی حکمت بالغہ کا شعور ملتا ہے۔لہٰذا اسلام سائنس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے کیوں کہ ہم اس کے ذریعے تخلیقاتِ خداوندی کی لطافتوں اور نزاکتوں کا بہتر مطالعہ کر سکتے ہیں۔

اسلام مطالعہ اور سائنس کی نہ صرف حوصلہ افزائی کرتا ہے بلکہ اس امر کی بھی اجازت دیتا ہے کہ اگر ہم چاہیں تو اپنے تحقیقی کام کو نتیجہ خیز بنانے کے لیے دین کے بیان کردہ حقائق سے بھی مدد لے سکتے ہیں۔اس سے ٹھوس نتائج برآمد ہونے کے ساتھ ساتھ منزل بھی جلد قریب آجائے گی۔اس کا سبب یہ ہے کہ دین وہ واحد ذریعہ ہے جو زندگی اور کائنات کے ظہور میں آنے سے متعلق سوالات کا صحیح اور متعین جواب فراہم کرتا ہے۔اگر تحقیق صحیح بنیادوں پر استوار ہو تو وہ کائنات کی ابتدا، مقصدِ زندگی اور نظام زندگی کے بارے میں مختصر ترین وقت میں کم سے کم قوت کو بروئے کار لاتے ہوئے بڑے حقائق تک پہنچا دے گی۔

آج سائنس نے جو ترقی کی ہے اس نے انسان پر حیرت کے دروازے کھول دیے ہیں، جس چیز کے متعلق آج سے ۵۰/یا ۱۰۰/سال پہلے سوچنا بھی محال تھا وہ ممکن ہو چکی ہے۔انسان زندگی کے ہر شعبے میں سائنسی علوم پر بھروسا کرتا اور اس کو اپناتا چلا جا رہا ہے مگر سائنس کا ایک نقصان دہ پہلو یہ سامنے آیا ہے کہ بعض مسلمان بھی دین کے معاملے میں سائنس کو بہت زیادہ اہمیت دینے لگے ہیں۔وہ سمجھتے ہیں کہ اسلام اور سائنس میں تضاد ہے، دونوں ایک ساتھ نہیں چل سکتے اور یہ کہ اسلام ایک قدیم مذہب ہے جو موجودہ زمانے کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتا، جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔

فزکس کے مشہور نوبل انعام یافتہ سائنس دان «البرٹ آئن سٹائن» کے بقول «سائنس مذہب کے بغیر لنگڑی ہے اور مذہب سائنس کے بغیر اندھا» اس کے معنی یہ ہیں کہ سائنس کو اگر مذہب کی روشنی اور رہنمائی حاصل نہ ہو تو وہ صحیح طور پر آگے کی طرف قدم نہیں بڑھا سکتی۔ایسا نہ کرنے سے یقینی نتائج کے حصول میں نہ صرف بہت سا وقت ضائع ہو جائے گا بلکہ اس سے بڑھ کر یہ امکان بھی غالب ہے کہ تحقیق بالکل بے نتیجہ اور ناقص رہے گی اور ماضی گواہ ہے کہ اکثر ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔مادہ پرست سائنس دانوں نے ماضی میں جو طریقہ اختیار کیا بالخصوص پچھلے ۲۰۰/سال میں، وہ جو مساعی بروئے کار لاتے رہے اس میں بہت سا وقت ضائع ہوا۔بہت سی تحقیق اکارت گئی اور اس پر صرف ہونے والا لاکھوں کروڑوں ڈالرز کا سرمایہ ضائع ہو گیا۔اس سے انسانیت کو کچھ بھی فائدہ حاصل نہ ہو سکا۔اس لیے کہ ان کی تحقیق غلط راستوں پر تھی۔یہی چیز مذہب اور سائنس کے درمیان ٹکراؤ کا باعث بنی اور اہل مذہب سائنس سے متنفر ہوئے۔

اس سے یہ بات واضح طور پر سمجھ لینی چاہیے کہ سائنس صرف اسی صورت میں قابل اعتماد نتائج حاصل کر سکتی ہے جب اس کی تحقیق و تفتیش کا مدعا و مقصد کائنات کے رازوں اور اشاروں کو سمجھنا ہو۔اگر اس کو اپنے وقت اور وسائل کو ضائع ہونے سے بچانا ہے تو اسے صحیح ہدایت کی روشنی میں صحیح راستے کا انتخاب کرنا ہوگا۔

یہ تصور کہ سائنس اور مذہب ایک دوسرے کے مخالف ہیں، یہودیت اور عیسائیت کے زیر اثر ممالک میں بھی اسی طرح پھیلا ہوا ہے جیسا کہ اسلامی دنیا میں ہے، خصوصیت سے سائنسی حلقوں میں اگر اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث کی جائے تو طویل مباحث کا ایک سلسلہ شروع ہو جائے گا۔مذہب اور سائنس کے مابین تعلق کسی ایک جگہ یا ایک وقت ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہا ہے۔یہ ایک امر واقعہ ہے کہ کسی توحید پرست مذہب میں کوئی ایسی تحریر نہیں ہے جو سائنس کو رد کرتی ہو۔تاہم حقیقت یہ ہے کہ ماضی میں چرچ کے حکم کے مطابق سائنسی علوم کا حصول اور اس کی جستجو گناہ قرار پائی تھی۔پادریوں نے عہد نامہ قدیم سے ایسی شہادتیں حاصل کیں جن میں لکھا ہوا تھا کہ وہ ممنوعہ درخت جس سے حضرت آدم نے پھل کھایا تھا وہ شجر علم تھا، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ ان سے ناراض ہوا اور اپنی رحمت سے محروم کر دیا۔سائنسی علوم چرچ کے حکم سے مسترد کر دیے گئے اور

ان کا حصول جرم قرار پایا۔زندہ جلا دیے جانے کے ڈر سے بہت سے سائنس داں جلا وطنی پر مجبور ہو گئے یہاں تک کہ انہیں توبہ کرنا، اپنے رویہ کو تبدیل کرنا اور معافی کا خواستگار ہونا پڑا۔مشہور سائنس دان گلیلیو پر اس لیے مقدمہ چلایا گیا کہ اس نے اس نظریہ کو مان لیا تھا جو زمین کی گردش کے بارے میں کوپرنیکس نے پیش کیا تھا اور اس مقدمے کے نتیجے میں گلیلیو کو سزائے موت ہوئی اور اسے موڑ کر توڑ دیا گیا، تاریخ میں اتنی خوف ناک سزائے موت شاید ہی کسی کو دی گئی ہو۔اور یہ نتیجہ تھا «کتابِ مقدس» بائبل کی ایک غلط تاویل کا۔

قرآن کے سائنسی پہلو کو سمجھنے کے لیے ہمیں پہلے سائنسی تحقیق کے بنیادی اصول جاننا چاہیے جو ۶/عوامل پر مشتمل ہیں۔

(۱) مشاہدہ Observation

(۲) مفروضہ Hypothesis

(۳) تجربہ EXperimentation

(۴) ثبوت یا عدم ثبوت Prove or Disprove

(۵) استخراج استنباط Induction /Deduction

(۶) مزید تجربات Further Experimentation

قرآن کریم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ اس مسلسل غور مشاہدہ اور مفروضہ کی بہترین مثال ہے۔حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چمکتے ستارے، چاند اور سورج کے نکلنے، ڈوبنے اور جسامت کے لحاظ سے جن مفروضوں پر بظاہر تکیہ کیا اور بالآخر خدا کی طرف مائل ہوئے اس میں بین السطور انہی تحقیقی اصولوں کی جھلک نظر آتی ہے اور اس طریقہ ہدایت کو دلیل خلف کہتے ہیں سائنس میں اس کے مماثل Antithesis ہے۔

ہمارے محققین نے قرآن کے سائنسی مزاج کی تشریح میں بڑا قابل قدر انکشاف کیا ہے۔مندرجہ بالا سائنسی تحقیق کے بنیادی اصولوں کو انہوں نے قرآن میں تلاش کر کے ان کے مماثل معانی رکھنے والے قرآنی الفاظ کے ایک ذخیرہ کی نشاندہی کی ہے۔ان کی تحقیق کے مطابق قرآن میں حسب ذیل الفاظ اور ان کے مشتقات تحقیق و تجسس کی علامت قرار پاتے ہیں۔

يَرَاَعُوْنَ۔رویت۔دیکھنا۔۲۹۸ دفعہ۔

يَنْظُرُوْنَ۔نظر مشاہدہ کرنا۔۱۳۰ دفعہ۔

يَعْقِلُوْنَ۔تعقل۔سمجھنا ۴۵ دفعہ۔

يَتَدَبَّرُوْنَ۔تدبر۔سوچنا۔۴۴ دفعہ۔

يَفْقَهُوْنَ۔تفقہ، سمجھنا۔۲۸ دفعہ۔

يَتَفَكَّرُوْنَ، تفکر۔خیال کرنا۔۱۸ دفعہ۔

اس کے علاوہ فطری مظاہرات سے متعلق آیات کی تعداد ۲۰۰/بتائی ہے اس طرح تقریباً ۷۷۰/مقامات پر قرآن کے اس سائنسی مزاج کی عکاسی ہوتی ہے۔یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ریڈر ڈاکٹر محمد شریف خاں نے اپنے ایک حالیہ مقالہ میں لکھا ہے کہ قرآن کریم میں اگر ۱۵۰/آیات احکامات مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج سے متعلق ہیں تو ۷۵۶/آیات مطالعۂ کائنات سے متعلق ہیں۔

سائنسی تحقیق کے متبادل مندرجہ بالا قرآنی الفاظ کی تعداد کے حوالہ سے ایک اور دلچسپ انکشاف بھی قابل غور ہے۔عام سائنسی طریقۂ تحقیق میں مشاہدات اور تجربات میں صرف ہونے والے وقت اور پھر ان مشاہدت کی بنا پر غور و فکر اور نتائج اخذ کرنے میں تقریباً ۳/اور ۱/کا تناسب ہوتا ہے۔مشاہدے کی اور اس کے مماثل آیات کی تعداد ۴۲۸/ہے جب کہ باقی آیات جن کا تعلق سوچ بچار سے ہے ۱۴۱/ہیں یعنی تقریباً ۳/اور ۱/کا تناسب جو قابل غور ہے۔

اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمانوں نے قرآن کریم میں کائنات کے مظاہر کے واضح اور خفی اشارات کی مدد سے جو کامیابیاں حاصل کیں وہ موجودہ سائنس میں ایک اہم مقام رکھتی ہیں۔اسلام سے پہلے انسانیت پر شرک کا غلبہ تھا جو فطرت پر تحقیق کرنے میں مانع تھا۔مشرک کے لیے فطرت کے مظاہر لائق عبادت تھے اور اس کا عقیدہ اس میں تجسس اور جرح کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔جب کہ قرآن ان مظاہر کی تسخیر کا حکم دیتا ہے۔فطرت کے خزانے تخلیق کے روز اول ہی سے زمین کے اندر اور باہر اور کائنات میں موجود تھے اور انسانی ذہن کی صلاحتیں بھی روز اول ہی سے پائی جاتی ہیں، مگر یہ قرآنی تعلیمات کا اثر تھا کہ مسلمان سائنس دانوں نے کائناتی مظاہر کی عبادت کا سلسلہ ختم کر دیا اور اس کے وسائل کی ماہیت میں تحقیق اور استعمال کی بنا ڈالی جو بالآخر اہم علوم کا سرچشمہ بن گئی۔اس سلسلہ میں جن مسلمان سائنس دانوں کے نام سر فہرست ہے ان میں سے چند یہ ہیں:

جابر بن حیان (کیمیا)، البیرونی (طبیعیات)، عمر خیام، الکندی (ریاضی) دمیری (حیوانیات) ابن الہیثم (عکاسی)، ابن سینا

(طب) اور زہراوی (سرجری) وغیرہ۔ تقریباً ۶ رصدیوں تک عربی زبان سائنسی دنیا کی زبان کے طور پر حاوی رہی جس کے مغرب پر دیرپا اثرات آج بھی قائم ہیں۔ مصری مورخ سید حسین نصر نے اپنی کتاب میں مسلم سائنس دانوں کے ایسے ایسے انکشافات کی نشان دہی کی ہے جو آگے چل کر بے شمار سائنسی ایجادات کا پیش خیمہ بنے۔

مسلم سائنس دانوں کے کارنامے

یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ اسلام کی انتہائی ترقی کے زمانہ میں جو آٹھویں اور بارہویں صدی عیسوی کے درمیان کا زمانہ ہے یعنی وہ زمانہ جب سائنسی ترقی پر عیسائی دنیا میں پابندیاں عائد تھیں، اسلامی جامعات میں مطالعہ اور تحقیقات کا کام بڑے پیمانہ پر جاری تھا۔ یہی وہ جامعات تھیں جنہوں نے عظیم مسلم سائنس دانوں کو جنم دیا۔ اس دور کے مسلم سائنس دانوں نے فلکیات، ریاضی، علم ہندسہ (جیومیٹری) اور طب وغیرہ کے شعبوں میں قابل قدر کارنامے انجام دیے۔ مسلمانوں نے یورپ میں بھی سائنسی علوم کی منتقلی میں اہم کردار ادا کیا اور اپنے ہاں بھی سائنس دانوں کی معقول تعداد پیدا کی۔ اندلس (اسپین) میں سائنسی علوم نے اتنی ترقی کی کہ اس ملک کو سائنسی ترقی اور انقلابی دریافتوں کی کٹھالی کہا جانے لگا، بالخصوص میڈیسن کے شعبے میں اس نے بے پناہ شہرت حاصل کرلی۔

مسلمان طبیبوں نے کسی ایک شعبے میں تخصیص پر زور دینے کی بجائے متعدد شعبوں بشمول علم دوا سازی، علم جراحت، علم امراض چشم، علم امراض نسواں، علم عضویات، علم جرثومیات اور علم حفظان صحت میں مہارت تامہ حاصل کرلی۔ اندلس کے حکیم ابن جلجول (۹۹۲ء) کو جڑی بوٹیوں اور طبی ادویہ اور تاریخ طب پر تصانیف کے باعث عالمی شہرت ملی۔ اس دور کا ایک اور ممتاز طبیب جعفر ابن الجذر (۱۰۰۹ء) جو تیونس کا رہنے والا تھا، اس نے خصوصی علاماتِ امراض پر تیس سے زیادہ کتابیں لکھیں۔ عبداللطیف البغدادی (۱۱۶۲ء-۱۲۳۲ء) کو علم تشریح الاعضا ANATOMY پر دست رس کی وجہ سے شہرت ملی۔ اس نے انسانی ہڈیوں کے بارے میں مروّجہ کتب میں پائی گئی غلطیوں کی بھی اصلاح کی۔ یہ غلطیاں زیادہ تر جبڑے اور چھاتی کی ہڈیوں کے متعلق تھیں۔ بغدادی کی کتاب «الافادہ والاعتبار» ۱۷۸۸ء میں دوبارہ زیور طباعت سے مزین ہوئی اور اس کے لاطینی جرمن اور فرانسیسی زبانوں میں تراجم کرائے گئے۔ اس کی کتاب «مقالات فی الحواس» پانچوں حواس کی کارکردگی کے بارے میں تھی۔

مسلم ماہرین تشریح الاعضا نے انسانی کھوپڑی میں موجود ہڈیوں کو بالکل صحیح شمار کیا اور کان میں تین چھوٹی چھوٹی ہڈیوں (میلس، انکس اور سٹیپز) کی موجودگی کی نشاندہی کی۔ تشریح الاعضا کے شعبے میں تحقیق کرنے والے مسلم سائنس دانوں میں ابن سینا (۹۸۰ء-۱۰۳۳ء) کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی جسے مغرب میں «ایویسینا AVICENNA» کہا جاتا ہے۔ اسے ابتدائی عمر میں ہی ادب، ریاضی، علم ہندسہ (جیومیٹری)، طبیعیات، فلسفہ اور منطق میں شہرت مل گئی تھی اور نہ صرف مشرق بلکہ مغرب میں بھی ان علوم میں اس کی شہرت پہنچ گئی تھی۔ اس کی تصنیف «القانون فی الطب» کو خصوصی شہرت ملی۔ (اسے مغرب میں کینن Canon کہا جاتا ہے۔) یہ عربی میں لکھی گئی تھی۔ ۱۲ رویں صدی میں اس کا لاطینی زبان میں ترجمہ ہوا اور ۱۷ رویں صدی تک یورپ کے سکولوں میں بطور نصابی کتاب پڑھائی جاتی رہی۔ یہ امراض اور دواؤں کے بارے میں ایک جامع تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ اس نے ۱۰۰ ر سے زیادہ کتابیں فلسفے اور نیچرل سائنسز پر لکھیں۔ اس کے علم کا بیش تر حصہ بشمول «القانون فی الطب» طبی معلومات پر مشتمل ہے جسے آج بھی ایک مسلّمہ حیثیت حاصل ہے۔

زکریا قزوینی نے دل اور دماغ کے بارے میں ان گمراہ کن نظریات کو غلط ثابت کیا جو ارسطو کے زمانے سے مروّج چلے آرہے تھے۔ چناں چہ انہوں نے جسم کے ان دو اہم ترین اعضا کے بارے میں ایسے ٹھوس حقائق بیان کیے جو ان کے بارے میں آج کی معلومات سے نہایت قریب ہیں۔ زکریا قزوینی، حمداللہ المستوفی القزوینی (۱۲۸۱ء-۱۳۵۰ء) اور ابن النفیس نے جدید طب کی بنیاد رکھی۔ ان سائنس دانوں نے ۱۳ رویں اور ۱۴ رویں صدی میں دل اور پھیپھڑوں کے درمیان گہرے تعلق کی نشان دہی کردی تھی۔ وہ یوں کہ «شریانیں آکسیجن ملا خون لے جاتی ہیں اور وریدیں بغیر آکسیجن خون کو لے جاتی ہیں» اور یہ کہ «خون میں آکسیجن کی آمیزش کا عمل پھیپھڑوں کے اندر انجام پاتا ہے» اور یہ بھی کہ «دل کی طرف واپس آنے والا آکسیجن ملا خون شریان کبیر Aorta کے ذریعہ دماغ اور دیگر اعضائے بدن کو پہنچتا ہے۔"

علی بن عیسیٰ (م ۱۰۳۸ء) نے امراض چشم پر تین جلدوں پر مشتمل ایک کتاب لکھی جس کی پہلی جلد میں آنکھ کی اندرونی ساخت کی مکمل تشریح اور وضاحت کی گئی ہے۔ ان تینوں جلدوں کا لاطینی اور جرمن زبانوں میں ترجمہ کردیا گیا ہے۔ محمد بن زکریا الرازی (۸۶۵ء-۹۲۵ء) برہان الدین نفیس (م ۱۴۳۸ھ) اسماعیل جرجانی (م ۱۳۶۰ء) قطب الدین الشیرازی (۱۲۳۶ء-۱۳۱۰ء) منصور ابن محمد اور ابوالقاسم الزہراوی مسلم سائنس دانوں میں وہ اہم شخصیات ہیں جنہیں طب اور تشریح الاعضا کے علوم میں دست رس کی وجہ سے شہرت ملی۔

مسلم سائنس دانوں نے طب اور تشریح الاعضا کے علاوہ بھی کئی شعبوں میں شان دار کارنامے انجام دیے۔ مثال کے طور پر البیرونی کو معلوم تھا کہ زمین اپنے محور کے گرد گردش کرتی ہے۔ یہ گلیلیو سے کوئی ۶۰۰ رسال قبل کا زمانہ تھا۔ اسی طرح اس نے نیوٹن سے ۷۰۰ رسال پہلے محورِ زمین کی پیمائش کرلی تھی۔ علی کوشوع Ali Khuschu پندرہویں صدی کا پہلا سائنس دان تھا جس نے چاند کا نقشہ بنایا اور چاند کے ایک خطے کو اسی کے نام سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ ۹ رویں صدی عیسوی کے ریاضی دان ثابت بن قرہ نے نیوٹن سے کئی صدیاں پہلے احصاے تفرقی DIFFERENTIAL CALCULUS ایجاد کرلی تھی۔ بطانی ۱۰ ویں صدی کا سائنس دان تھا جو علم مثلثات TIRGNOMETERY کو ترقی دینے والا پہلا شخص تھا۔ ابوالوفا محمد البزنجانی نے احصاے تفرقی (حساب کتاب کا ایک خاص طریقہ) میں پہلی بار «مماس ومماس التمام» TANGENT/COTANGENT اور «خط قاطع وقاطع التمام» SECANT-COSEANT متعارف کرائے۔

الخوارزمی نے ۹ رویں صدی میں الجبرا پر پہلی کتاب لکھی۔ المغربی نے فرانسیسی ریاضی دان پاسکل کے نام سے مشہور مساوات «مثلث پاسکل» اس سے ۶۰۰ رسال پہلے ایجاد کرلی تھی۔ ابن الہیثم ۱۱ ویں صدی میں گزرا ہے علم بصریات کا ماہر تھا۔ راجر بیکن اور کیپلر نے اس کے کام سے بہت استفادہ کیا جب کہ گلیلیو نے اپنی دوربین انھیں کے حوالے سے بنائی۔

الکندی نے علاقی طبیعیات اور نظریۂ اضافت آئن سٹائن سے ۱۱۰۰ رسال پہلے متعارف کرا دیا تھا۔ شمس الدین نے پاسچر سے ۴۰۰ ر سال پہلے جراثیم دریافت کرلیے تھے۔ علی ابن العباس نے جو ۱۰ رویں صدی میں گزرا تھا کینسر کی پہلی سرجری کی تھی۔ ابن الجسر نے جذام کے اسباب معلوم کیے اور اس کے علاج کے طریقے بھی دریافت کیے۔

یہاں چند ایک ہی مسلمان سائنس دانوں کا ذکر کیا جاسکا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے سائنس کے مختلف شعبوں میں اتنے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں کہ انہیں بجا طور پر سائنس کا بانی کہا جاسکتا ہے۔

۸۰۰ رسال تک مسلمان سائنس کے علم بردار رہے۔ جب تک سائنس مسلمانوں کے پاس تھی عقیدتاً خدا پرست رہی اور اس سارے عرصہ میں مسلمانوں نے حکمت کو خدا کی امانت سمجھ کر خدا کی بتائی ہوئی حدود میں اس کی پرورش کی اور انسانیت کے فلاح و بہبود کے لیے بہت کام کیا جس کی کچھ تفصیل اوپر دی گئی ہے۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ جب ان میں انحطاط آگیا تو اہل یورپ نے اس کو اپنی گود میں لے لیا اور اس طویل عرصہ میں اس کی اصل شناخت بھی ختم ہوگئی۔ شاید اسی آنے والی کیفیت کی طرف حضور اکرم ﷺ نے اشارہ کیا تھا۔ «حکمت مؤمن کی گمشدہ دولت ہے۔» ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرپرستی کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ سائنس کے عقیدہ میں بھی تبدیلی آگئی۔ یعنی جب اس کی فطرت بدل گئی تو اس سے انسان کی نسل کشی کا بھی کام لیا گیا جس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب نے سائنس کو اقدار سے لاتعلق بنا دیا جب کہ مسلمانوں کے نزدیک ہر کام میں سبب اور اثر کے ساتھ سزا اور جزا کا تصور بھی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آج انسان کے پاس ایسے ہتھیار اور پروسس ہیں جو اگر بے دریغ استعمال کیے جائیں تو انسانیت کو کرۂ ارض سے نیست و نابود کیا جاسکتا ہے۔ خدا ترسی ہی وہ جذبہ ہے جو احتساب کے خیال سے انسان کو محتاط رویہ اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

آج کا دور اپنے وسیع تر معنوں میں سائنسی دور ہے۔ مشاہدہ اور تجربہ کا جو میلان سائنس نے دیا ہے وہ قرآنی اصول ہے۔ قرآن اور سائنس کا ربط مخلوق کو خالق تک رسائی کا موقع دیتا ہے اور وہ بے اختیار کہتا ہے کہ اے خدا تو نے اس کائنات کو بے غرض و غایت نہیں پیدا کیا۔ ایسا سوچنا بہ طور خود ایک مثبت رویہ کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ معرفت الٰہی کی پہلی منزل ہے خدا ہم کو قرآن فہمی اور اس پر عمل کرنے کی توفیق دے۔

اب ہم ذیل کی سطور میں قرآن کی الہامی ترتیب اور ریاضیاتی معجزہ پر بحث کریں گے جو اس بات کے بین ثبوت ہیں کہ قرآن ایک الہامی کتاب ہے، کسی انسان کا کلام نہیں، جیسا کہ بعض مستشرقین اسے حضور اکرم ﷺ کا کلام کہتے ہیں۔

(جاری)

پیشین گوئی

حضرت نعمت اللہ شاہ ولی رحمۃ اللہ علیہ---ترجمہ: حافظ محمد سرور نظامی پاکستان

معروف تاجر اور صاحب خیر عالی جناب الحاج رفیق برکاتی صاحب نے یہ دستاویزی مقالہ برائے اشاعت راقم الحروف کو عطا فرمایا ہم ان کے شکریے کے ساتھ یہ گراں قدر مقالہ قسط وار اشرفیہ کے صفحات پر پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ یہ مقالہ در اصل جلیل القدر ولی حضرت نعمت اللہ شاہ علیہ الرحمہ کے اشعار کی توضیح و تشریح پر مشتمل ہے۔ یہ خدمت حافظ محمد سرور نظامی نے بڑے سلیقے سے انجام دی ہے۔ مرتب و شارح اپنے مقالے کے پیشِ لفظ میں رقم طراز ہیں:

لوحِ محفوظ است پیشِ اولیا　　　از چہ محفوظ است محفوظ از خطا

ترجمہ: لوحِ محفوظ اولیاء اللہ کے سامنے ہوتی ہے، جو کچھ وہاں پر محفوظ ہے وہ خطا سے غلطی سے پاک ہے۔ حضرت نعمت اللہ شاہ ولی کشمیری ایک عظیم اللہ والے گزرے ہیں، جفر کا علم تو حضور کا غلام تھا۔ یہ آپ کی ادنیٰ کرامت ہے کہ حضور نے آج سے آٹھ سو سال پیش تر پیش گوئی ارشاد فرمائی اور وہ حرف بہ حرف پوری ہوتی چلی آرہی ہے۔ بعض حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ حضور نے تقریباً دو ہزار اشعار سپردِ قلم کیے ہیں جن میں سے راقم الحروف کے پاس دو سو اڑتالیس اشعار ہیں۔ بعض کی ردیف "مے بینم" اور بعض کی ردیف "پیدا شود" ہے اور بعض قافیہ بیانہ، میزانہ، یگانہ وغیرہ رکھتے ہیں۔ آپ مختلف شہروں میں سیاحت فرماتے ہوئے کشمیر تشریف لائے اور وہیں وصال فرمایا۔

چناں چہ راقم الحروف کے ذہن میں ایک عرصہ سے خیال پیدا ہوا کہ ان اشعار کو یک جا کر کے طباعت کرائی جائے تاکہ یہ مجموعہ محفوظ ہو جائے۔

قدرتِ کردگار می بینم　　　حالتِ روزگار می بینم

[ترجمہ] میں خدا کی قدرت مشاہدہ کرتے ہوئے زمانہ کی حالت دیکھ رہا ہوں۔

از نجوم ایں سخن نمی گویم　　　بلکہ از سرِّ یار می بینم

[ترجمہ] یہ باتیں نجوم کے اعتبار سے نہیں کہہ رہا ہوں، بلکہ اپنے یار کے رازوں میں سے دیکھ رہا ہوں۔

از سلاطینِ گردشِ دوراں　　　یک یہ را سوار می بینم

[ترجمہ] اس زمانہ کے بادشاہوں میں سے ایک کے بعد ایک سوار دیکھ رہا ہوں۔

ہر یکے را بشکل ذرہ نور　　　پرتوِ آشکار می بینم

[ترجمہ] ہر ایک کو ذرہ نور کے مثل ایک پرتو ظاہری طور پر دیکھ رہا ہوں۔

بعد از آں ائمۂ اطہار　　　دیگرے را سوار می بینم

[ترجمہ] آل ائمۂ اطہار کے بعد دوسرے کی حکومت دیکھ رہا ہوں۔

از پس شاہی ہمہ ایں با　　　چند سلطاں بکار می بینم

[ترجمہ] ان کی بادشاہت کے بعد پھر چند ایک سلطان بنتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔

از بزرگی و رفعتِ ایشاں　　　صفوی برقرار می بینم

[ترجمہ] ان کی بزرگی اور رفعت کو میں صفوی خاندان میں دیکھ رہا ہوں۔

آخر بادشاہیِ صفوی!!!　　　یک حسینی بکار می بینم

[ترجمہ] صفوی خاندان کا آخری بادشاہ ایک حسینی خاندان کا ہوگا۔

از بخارا، ہرات و بلخ سرخس　　　لشکرِ بے شمار می بینم

[ترجمہ] بخارا، ہرات، بلخ اور سرخس سے بے شمار لشکر آتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔

باز بعد از خرابیِ ایشاں　　　ساربانی بکار می بینم

[ترجمہ] ان کی تباہی اور خرابی کے بعد ایک ساربان کو حکومت ملے گی جسے میں دیکھ رہا ہوں۔

نادرے در جہاں شود پیدا　　　قامتش استوار می بینم

[ترجمہ] نادر شاہ دنیا میں پیدا ہوگا، اس کی حکومت کو بھی استواری پیدا ہوگی، میں دیکھ رہا ہوں۔

بست و شش سال بادشاہیِ او　　　تا بہ گردوں غبار می بینم

[ترجمہ] وہ چھبیس سال تک بادشاہی کرے گا، اس کا غبار آسمانوں تک اڑتا ہوا میں دیکھ رہا ہوں۔

آخرِ عہدِ نوجوانیِ او　　　قتلِ او آشکار می بینم

[ترجمہ] وہ جوانی کے زمانہ میں قتل ہو جائے گا، اس کے قتل کو میں صاف طور پر دیکھ رہا ہوں۔

بعد از اں دیگرے فنا گردد　　　شاہِ دیگر بکار می بینم

[ترجمہ] اس کے بعد کسی دوسرے سے مارا جائے گا، پھر ایک بادشاہ حکومت کرے گا۔

بادشاہی زنو شود پیدا　　　تیغِ او آب دار می بینم

[ترجمہ] اب بادشاہی از سرِ نو بنے گی، میں ان کی تیغوں کو آب دار دیکھ رہا ہوں۔

بست و پنج است بادشاہیِ او　　　سکہ اش بے عیار می بینم

[ترجمہ] اس کی بادشاہی پچیس سال تک ہوگی، اس کا سکہ رائج ہوگا، میں دیکھ رہا ہوں۔

چوں ز نسلش بسے ولد ناند　　　بو العجب روزگار می بینم

[ترجمہ] اس کی نسل سے بہت اولاد ہوگی، زمانہ تعجب انگیز ہوگا۔

بادشاہے بود محمد نام　　　شہیشِ باوقار می بینم

[ترجمہ] ایک بادشاہ محمد نامی ہوگا، وہ بہت باوقار ہوگا، میں دیکھ رہا ہوں۔

دہ و ہفت است پادشاہیِ او　　　اولش باوقار می بینم

[ترجمہ] اس کی بادشاہی سترہ سال ہوگی۔ وہ پہلا باوقار بادشاہ ہوگا۔

بادشاہے زمست ترکستان　　　دفعِ اشرار زار می بینم

[ترجمہ] ایک بادشاہ ترکستان کی طرف سے آئے گا، وہ دشمنوں کو دفع کرے گا۔

اربعین است پادشاہیِ او　　　دولتش کام کار می بینم

[ترجمہ] اس کی بادشاہی چالیس سال ہوگی، اس کا سکہ بھی جاری ہوگا۔

دائم اورا ہے نہ کثرتِ لیل　　　لیلِ او بے نہار می بینم

[ترجمہ] وہ ہمیشہ راتوں کو جاگتا رہے گا۔ اس کی راتیں بغیر دن کے ہوں گی۔

لیک آں شاہ را زیانے است　　　محرمِ او نگار می بینم

[ترجمہ] لیکن اس بادشاہ کو بھی ایک نقصان ہوگا، اس کا محرم محبوب ہوگا۔

چوں فریدوں بتخت بنشیند　　　دولتش برقرار می بینم

[ترجمہ] جب فریدون تخت پر بیٹھے گا تو اس کی بادشاہی کو قرار حاصل ہوگا۔

صرصرِ دیگر شود پیدا　　　پاے او در رکاب می بینم

[ترجمہ] ایک دفعہ پھر تیز و تند ہوا سے اس کا نقصان ہوگا، اس کو پھر قیام حاصل نہ ہوگا۔

مسکنِ فوت او در اصفہاں　　　بر سرِ مرغ زار می بینم

[ترجمہ] اس کی قبر اصفہان میں ایک سرسبز قطعہ میں ہوگی۔

حاکم قندھار مثل شتر　　　بر دماغش مہار می بینم

[ترجمہ] حاکمِ قندھار اٹھے گا جس کے منہ میں مثل اونٹ کے مہار ہوگی، یعنی وہ ہمیشہ سواری کرے گا۔

حکم در بارۂ اش صدو دہند　　　سرِ او را بدار می بینم

[ترجمہ] اس کے لیے حکم دیا جائے گا کہ اس کو سولی دی جائے

ناگہاں شخصے از توابع لد　　　حاکمِ کامگار می بینم

[ترجمہ] اچانک ایک شخص لد کے تابعین میں سے ظاہر ہوگا، جس کی حکومت چلے گی۔

ہست شاہ و وکیل خوانندش　　　کم تریں ہوشیار می بینم

[ترجمہ] بادشاہ اور اس کے وزرا کم ترین ہوشیار میں دیکھ رہا ہوں۔

لشکرش سی صد صف برائے جلال　　　جنگِ او آشکار می بینم

[ترجمہ] اس لشکر میں تیس ہزار صفیں ہوں گی، جو اس کے جاہ و جلال کو ظاہر کرتی ہیں، اس کے عہد میں جنگ ہوگی۔

عہد آں شاہ کشورِ دوراں　　　دو بلا آشکار می بینم

[ترجمہ] اس بادشاہ فاتح کے عہد میں دو مصائب ظاہر ہوں

گے، میں دیکھ رہا ہوں۔

یک تزلزل بود یکے طاعون　　حالِ مردم فگار می بینم

[ترجمہ] ایک زلزلہ اور دوسرا طاعون ظاہر ہوگا۔ لوگوں کا حال بہت خراب ہوگا۔

غارت و قتل شیعانِ علی　　دستِ ایشاں بکار می بینم

[ترجمہ] شیعانِ علی کو یہ لوگ قتل کرنے میں مصروف ہوں گے، میں دیکھ رہا ہوں۔

غنین وسین چونکہ بگزرد از سال　　ایں اساس آشکار می بینم

[ترجمہ] جس وقت ایک ہزار ساٹھ سال گزر جائیں گے تو یہ سب کچھ ظاہر ہوگا۔

شہر تبریز را چوں کوفہ کنند　　شہر تہراں قرار می بینم

[ترجمہ] تبریز کو کوفہ بنادیں گے، البتہ تہران میں امن رہے گا۔

جنگِ اودرمیان تبریز است　　فتح او آشکار می بینم

[ترجمہ] یہ جنگ تبریز کے درمیان ہوگی اور اس کی فتح کو میں آشکار دیکھ رہا ہوں۔

دراصفہاں چواو پیادہ شود　　در ابر غو سوار می بینم

[ترجمہ] جب وہ اصفہان میں پیدل چل رہا ہوگا تو ایک سوار ظاہر ہوگا۔

چوں بہم می رسند شاہ وسوار　　قتل او آشکار می بینم

[ترجمہ] بادشاہوں کے قتل پر پھر جنگ شروع ہوجائے گی، میں دیکھ رہا ہوں۔

بعدازاں دیگرے فنا گردد　　شاہِ دیگر بکار می بینم

[ترجمہ] اس کے بعد دوسرے فنا ہوجائیں گے، ایک دوسرا بادشاہ بادشاہی کرے گا۔

بادشاہی کند چو بست ودو سال　　کارش آخر بزار می بینم

[ترجمہ] بائیس سال حکومت کی ہوگی۔ آخر اس کو بھی زوال ہوگا۔

بعد ازاں لُر و گر آید　　ظالم و نابکار می بینم

[ترجمہ] اس کے بعد ایک لُر پھر دوسرا لُر آئے گا۔ یہ ظالم اور فاجر ہوں گے۔

سکۂ نوزنند چو بر رُخِ زر　　درہمش کم عیار می بینم

[ترجمہ] ان کا سکہ سونے پر ضرب کیا جائے گا۔ اس کے درہم کو کم عیار میں دیکھ رہا ہوں۔

ہفت سال است پادشاہیِ او　　دولتش بیم دار می بینم

[ترجمہ] وہ صرف سات سال بادشاہی کرے گا، اس کی حکومت خوف رکھنے والی میں دیکھ رہا ہوں۔

چوں زمستاں پنجمیں گزرد　　ششمین خوش بہاری بینم

[ترجمہ] جب پانچ جاڑے گزر جائیں گے اور چھٹی بہار آئے گی۔

حال اسال صورت دگر است　　نہ چو پیری و باری بینم

[ترجمہ] تو اس سال کی حالت مختلف ہوجائے گی، بڑھاپے کی طرح جلد گزر جانے والی حالت نہ ہوگی۔

بادشاہے بہ تخت بہ نشستند　　دولتش پائیدار می بینم

[ترجمہ] جو بادشاہ تخت پر بیٹھے گا اس کی حکومت پائیدار ہوگی۔

آں حسن خلق آں حسن طینت　　بابِ عالی تبار می بینم

[ترجمہ] وہ اچھا خلق اور اچھی طینت رکھیں گے، ان کی شان عالی ہوگی۔

فرد مردانہ اولوا العزمی　　محرمِ آشکار می بینم

[ترجمہ] وہ مردانہ عزم و ہمت کے مالک ہوں گے، حالات سے واقف ہوں گے۔

میم از اول و دال از آخر　　نام او نام دار می بینم

[ترجمہ] اس کے نام سے پہلے میم اور آخر میں دال ہوگا۔ وہ دنیا میں نام پائے گا۔

بادشاہے تمام دانائے　　در ہمہ کار زار می بینم

[ترجمہ] تمام بادشاہوں سے دانا ہوگا اور ہر قسم کے امور میں مصروف ہوگا۔

ناگہاں کشتہ می شود در خواب　　قاتلِ آں چہار می بینم

[ترجمہ] اچانک اسے سوتے میں قتل کردیا جائے گا۔ اس کے قاتل چار ہوں گے۔

بعد از دیگرے فنا گردد　　شاہ دیگر بکار می بینم

[ترجمہ] اس کے بعد دوسرا اسے ماردے گا اور اس دوسرے کی بادشاہت شروع ہوگی۔

کہ محمد بنام او باشد　　تیغِ او آب دار می بینم

[ترجمہ] اس کا نام محمد ہوگا، اس کی تلوار خوب کام کرے گی۔

چار دہ سال پادشاہی او　　دولتش کام گار می بینم

[ترجمہ] اس کی بادشاہت چودہ سال رہے گی، اس کی حکومت کامیاب ہوگی۔

سال کز مرغ می شود پیدا　　قوت او آشکار می بینم

[ترجمہ] اس کی حکومت میں جانور بہت پیدا ہوں گے، اس کی طاقت ظاہر ہوگی۔

بعدازاں دیگرے فنا گردد　　شاہ دیگر بکار می بینم

[ترجمہ] اس کو بھی کوئی دوسرا ماردے گا، اور پھر دوسرے کی حکومت بنے گی۔

ناصرالدیں بہ نصرتِ دوراں　　چار دہ ہشت سال می بینم

[ترجمہ] اس کا نام ناصر الدین ہوگا، اس کی حکومت اڑتالیس سال ہوگی۔

کوکب روشنی بود پیدا　　یا نجم و مدار می بینم

[ترجمہ] اس کے عہد میں کوئی روشنی والا ستارہ یا دم دار ستارہ ظاہر ہوگا۔

ازخراساں و دراصفہاں ہم　　چہ دبلہکا بکار می بینم

[ترجمہ] وہ خراسان اور اصفہان میں بھی نظر آئے گا اور اس کا شہرہ عام ہوگا۔

روزہ جمعہ ز شہر ذی قعد　　تن او در مزار می بینم

[ترجمہ] جمعہ کے دن ذی قعدہ کے مہینے میں وہ فوت ہوجائے گا۔

شاہ دیگر بکار می آید　　شاہیش ناگوار می بینم

[ترجمہ] اب دوسرا بادشاہ حکومت سنبھالے گا، اس کی بادشاہت ناگوار ہوگی۔

چہار شنبہ ز شہر ذی قعدہ　　مرگ او آشکار می بینم

[ترجمہ] وہ بھی بدھ کے دن ذی قعدہ کے مہینے میں مرجائے گا۔

بعدازاں دیگرے فنا گردد　　پسرش یادگار می بینم

[ترجمہ] اس کو بھی کوئی دوسرا ماردے گا تو اس کا لڑکا تخت نشین ہوگا۔

بعدازاں شاہ مظفر الدیں را　　تو بداں برقرار می بینم

[ترجمہ] اس کے بعد مظفر الدین شاہ کو تخت حکومت ملے گا۔

از الف تا بدال می گویم　　شاہین را مدار می بینم

[ترجمہ] الف سے دال تک جس قدر بادشاہوں کا ذکر کیا ہے ان کو قرار ہوگا۔

چوں گزشت از سریر دولت او　　تو نہ بیں من دو یاری بینم

[ترجمہ] جب اس کا بھی دورِ حکومت گزر جائے گا میں دو مرتبہ اسے دیکھ رہا ہوں تو نہیں دیکھتا۔

شاہ چوں بیروں رود ز جائیکش　　شاہِ دیگر بکار می بینم

[ترجمہ] جب یہ بادشاہ کسی جگہ باہر گیا ہوگا تو دوسرا اس کے تخت پر قبضہ کرے گا۔

نوجوانِ مثالِ سرو بلند　　دستمش بندہ دار می بینم

[ترجمہ] ایک نوجوان سرو قد ایسا آئے گا اس کے ہاتھ سے آدمیوں کو پھانسی ملے گی۔

دررموزِ شہے امت بے تدبیر　　لیکنش بخت یار می بینم

[ترجمہ] یہ بادشاہ بے تدبیر ہوگا لیکن اس کا نصیب طاقت ور ہوگا۔

احتساب وحساب در عہدش　　ست و بے اختیار می بینم

[ترجمہ] اس کے عہد میں قانون اور حساب کتاب سست اور بے اختیار ہوگا۔

ظلم پنہاں خیانت وتزویر　　بر اعاظم شعار می بینم

[ترجمہ] پوشیدہ ظلم، خیانت، تزویر تمام بر اعظم میں ہوگا۔

دولتش بے حساب می دانم　　مکنیش بے شمار می بینم

[ترجمہ] اس کی دولت تو بے حساب ہوگی، اس کی آبادیاں بھی بہت ہوں گی۔

در حقیقت شہے بود ظالم　　عادی از گیر و دار می بینم

[ترجمہ] لیکن حقیقت میں وہ ظالم بادشاہ ہوگا، پکڑ دھکڑ کا وہ عادی ہوگا۔

علمائے زمان او دائم　　ہمہ را مار و مار می بینم

[ترجمہ] اس کے دور کے علما بھی لوٹ مار میں مصروف ہوں گے۔

دائم اسپش بزیر زین طلا　　کم تراں را سوار می بینم

[ترجمہ] وہ ہمیشہ طلائی زین پر سوار رہے گا، اس سے کم تروں کو سوار میں دیکھ رہا ہوں۔

چوں فریدوں بہ تخت بہ نشیند　　سپرانش قطار می بینم

[ترجمہ] جب فریدوں تخت نشین ہوگا تو اس کی اولاد بھی بہت ہوگی۔

ہست فضل الخطاب در عہدش　　فضل را مات دار می بینم

[ترجمہ] اکثر لوگوں کو اس کے عہد میں خطاب ملیں گے، اس کا کرم عام ہوگا۔

کاروبارِ زمانہ وا رفتہ　　قحط ہم ننگ و عار می بینم

[ترجمہ] جب اس کا زمانہ گزر جائے گا تو شرم وحیا بھی اٹھ جائے گی۔

عدل وانصاف در زمانۂ او　　ہیچو ہمہ بنار می بینم

[ترجمہ] اس زمانہ میں عدل وانصاف کو آگ میں ڈال دیا جائے گا۔

درزمانش وفاوعہدِ دوست ہمچو یخ در بہار می بینم

[ترجمہ] اس زمانہ میں وفااور عہد دوستی برف کی طرح سرد ہوجائیں گے۔

پس فرومایہ گاں بے حاصل حاملِ کاروبار می بینم

[ترجمہ] اس کے بعد کمینوں کے ہاتھ میں حکومت آجائے گی

کہنہ رندے کار اہرمنی اندریں روزگار می بینم

[ترجمہ] شراب خوری اوراہرمنی پرستی کا دوردورہ ہوگا۔

متصف برصفات سطانست لیک من گرگ وار می بینم

[ترجمہ] خلقت سلطان کی صفت سے اثر پذیر ہوتی ہے۔ میں ان کو بھی بھیڑیا صفت دیکھتا ہوں۔

چودودہ سال پادشاہی کرد سہیش را تبار می بینم

[ترجمہ] اس بادشاہ کو بارہ سال ہوجائیں گے تو یہ بادشاہ بھی فوت ہوجائے گا۔

پسرش چوں تخت بہ نشیند بوالعجب روزگار می بینم

[ترجمہ] اس کا بیٹا تخت نشیں ہوگا۔ اس وقت حالات عجیب تر ہوجائیں گے۔

غارت وقتل مردمِ ایراں دست خارج بکار می بینم

[ترجمہ] ایران میں قتل و غارت گری کے سوا کچھ نہ پایا جائے گا۔

جنگ وآشوب وفتنہ بسیار در یمین و یسار می بینم

[ترجمہ] دائیں بائیں جنگ آشوب فتنہ بہت ہوگا۔

درخراسان ومصروشام وعراق فتنہ و کارزار می بینم

[ترجمہ] خراسان، مصر، شام اور عراق میں بھی فتنہ اور جنگ ظاہر ہوگی۔

غارت وقتل لشکرِ بسیار درمیان و کنار می بینم

[ترجمہ] بہت سا لشکر قتل اور تباہ ہوگا، ملک کے وسط میں اور سرحدوں میں بھی ایسا ہوگا۔

نائب، مہدی آشکارشعور بلکہ من آشکار می بینم

[ترجمہ] نائب مہدی کا ظہور ہوگا، بلکہ میں تو اسے ظاہر دیکھ رہا ہوں۔

قائم شرع آلِ پیغمبر در جہاں آشکار می بینم

[ترجمہ] آلِ پیغمبر کی شرع کا قائم کرنے والا جہاں میں ظاہر ہوگا۔

صورتِ نیمۂ ہمہ خورشید بنظر آشکار می بینم

[ترجمہ] اس کی صورت دوپہر کے چمکنے والے سورج کی مانند ہوگی۔

سمت مشرق زیں طلوع کند ظہور دجال زار می بینم

[ترجمہ] اس کی مشرق کی جانب سے دجال لعین کا ظہور ہوگا۔

رنگ یک چشم او بشم کبود خرے برخر سوار می بینم

[ترجمہ] اس کی ایک آنکھ میں پھولا ہوگا اور ایک گدھے پر سوار ہوگا ایک گدھا۔ (یعنی گدھے پر گدھا سوار ہوگا)

لشکر او بود اصفہاں ہم یہود و نصاریٰ می بینم

[ترجمہ] اس کا لشکر اصفہان میں ہوگا۔ یہود و نصاریٰ اس کے لشکر میں ہوں گے۔

ہم مسیح از سما فرود آید پسِ کوفہ غبار می آید

[ترجمہ] حضرت مسیح بھی آسمان سے اتر آئیں گے، میں کوفہ میں غبار دیکھ رہا ہوں۔

کوفیاں تمام کشتہ شوند باہزاروں سوار می بینم

[ترجمہ] تمام کوفی مارے جائیں گے حضرت مسیح کے ساتھ ہزاروں سوار ہوں گے۔

از دمِ تیغِ عیسیٰ مریم قتل دجال زار می بینم

[ترجمہ] عیسیٰ بن مریم کی تلوار سے دجال لعین کا قتل ہوگا۔

مسکنش شہر کوفہ خواہد بود دولتش پائیدار می بینم

[ترجمہ] اس کا قیام کوفہ شہر میں ہوگا، اس کی حکومت مستحکم ہوگی۔

زینتِ شرع دین از اسلام محکم و استوار می بینم

[ترجمہ] اسلام کی شریعت سے دین کو زینت ہوگی، اور محکم و استوار ہوگی۔

کاروانِ نقد و اسکندر ہمہ در راہ کار می بینم

[ترجمہ] دولت مند اور جاہ وحشمت والے سب لوگ ان کی راہ میں کام کریں گے۔

نہ دروے بخود ہمے گویم بلکہ از سرِّ یار می بینم

[ترجمہ] یہ وارداتیں میں اپنی طرف سے نہیں کہتا بلکہ ذات باری تعالیٰ کے رازوں کو میں دیکھتا ہوں۔

نعمت اللہ نشست در کنجے ہمہ را در کنار می بینم

[ترجمہ] نعمت اللہ ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا ہے اور سب کچھ ایک کنارہ میں دیکھ رہا ہوں۔

واقعہ کربلا اور درس عبرت و عمل

مولانا محمد عبد المبین نعمانی قادری

واقعہ فاجعہ کربلائے معلّٰی اور شہادتِ امام حسین گل گوں قبا علیٰ جدہ و علیہ الثنا نے عالمی پیمانے پر اور رہتی دنیا تک کے لیے جو سبق دیا ہے، اسے یاد رکھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت ہے۔ آج جب کہ اسلام کو طرح طرح سے بدنام کرنے کی سازشیں رچی جارہی ہیں، حسین باوفا علیہ الرحمۃ والرضا کا کردار اس سازش کا بھی پردہ چاک کر رہا ہے کہ اسلام ظلم وزیادتی کا سب سے بڑا دشمن ہے، ظلم اپنے کریں یا غیر اسلام کا سچا فدائی ہر حال میں اس کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ آج حیرت ہے کہ یزید پلید کو برحق کہنے والے، اس کو امیر المومنین کا جھوٹا لقب دینے والے، امریکہ اور اس کے دیگر حمایتیوں کی ہاں میں ہاں ملارہے ہیں۔ امریکہ ظلم کر رہا ہے تو اس کو برحق بتارہے ہیں، اپنے ہی مسلم بھائیوں کو نیست ونابود کرنے کے لیے ظالموں کو دعوت دے کر قتل عام کو روا رکھ رہے ہیں، عراق میں جو ہوا، افغانستان میں جو ہوا اور ہو رہا ہے، آج پوری دنیا کی نگاہوں میں ہے۔ افسوس کہ یہی یزیدی کردار کے حامل اور یہودی نواز خوں خوار نجدی حرمین محترمین پر قابض ہیں اور ساری دنیا میں وہ لٹریچر تقسیم کر رہے ہیں جن سے مسلمانوں کا اتحاد پارہ پارہ ہو رہا ہے اور اسلام کے کھلے دشمنوں کو مسلمانوں کے خلاف کھیل کھیلنے اور سازشیں رچنے کا موقع مل رہا ہے۔ مسلمان کٹ مرجائیں، مسلمان بکھر جائیں، ان کو اس کی کچھ پروا نہیں۔ انھیں اگر کچھ فکر ہے تو مسلمانوں کو وہابی بنانے کی، یہی تو یہودی چال ہے کہ مسلمانوں کو بدعقیدہ بنادو، پھر جب ان کے اندر صحیح ایمانی روح باقی نہیں رہے گی تو انھیں شکست دینا آسان ہوگا۔ لڑاؤ اور حکومت کرو کی سازش اور پالیسی سعودی حکومت کے ذریعہ پوری دنیا میں کارفرما ہے۔ آخر کتنی آبادیاں ہیں جہاں کل ایک بھی وہابی نہیں تھا، وہاں سعودی ایجنٹوں نے پیسے دے دے کر مسجد و مدرسہ بنوادیا اور اپنا ایک مولوی رکھ دیا جس کی وجہ سے پوری آبادی افتراق وشقاق کا شکار ہوگئی۔ کل جہاں مسلمان متحد تھا، آج وہاں لڑائیاں ہورہی ہیں، آئے دن ایک دوسرے کے خلاف بیان بازیاں اور تقریریں ہورہی ہیں، مسلمان آپس میں لڑ رہے ہیں، اپنے مال برباد کر رہے ہیں اور کھلے غیر مسلموں کو ہنسنے کا موقع فراہم ہو رہا ہے۔ جہاں مسلمان متحد ہیں، ان کی مساجد و مدارس بھی پہلے سے قائم ہیں، وہاں ایسی حرکتیں کرنا اور لڑانا یہودی سازش نہیں تو کیا ہے؟ بیت المقدس میں فلسطین کے مسلمانوں کے ساتھ یہودی ظالم کیا کچھ نہیں کر رہے ہیں اور پورا عالم اسلام چیخ رہا ہے۔ لیکن امریکہ کی آنکھ پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔ اسے فکر ہے تو عراق اور افغانستان کو کھانے کی، اور ساتھ ہی اس کا پٹھو سعودی عرب بھی چپ سادھے ہوئے ہے، جب کہ یہی سعودی ہیں کہ ان کو کویت بچانے کی بڑی فکر تھی لیکن آج بیت المقدس کے لیے ان کے پاس کوئی فارمولہ نہیں، اس کے لیے "یا امریکہ المدد" کی ندا نہیں لگائی جارہی ہے۔ آج پٹرول اور ڈالر کے بل بوتے پر اخبارات نکالے جارہے ہیں اور جو نکل رہے ہیں انھیں خریدا جارہا ہے، تاکہ یک طرفہ کارروائی کی جائے، صحیح العقیدہ مسلمانوں کو نظر انداز کیا جائے، بدعقیدگی کا خوب پرچار کیا جائے۔ ان حالات میں اس حسینی کردار کو اپنانے کی ضرورت ہے۔ جس نے کربلا کی سرزمین پر حق و باطل کا فیصلہ کردیا تھا۔ وہاں بھی سامنے کلمہ گو اور پیچھے سے یہودی تھے، یہاں بھی سامنے خدمتِ حرمین کا ڈھنڈورا پیٹنے والے کلمہ گو ہیں اور یہودی پیچھے۔ یہودی ہوں یا عیسائی، یا لا مذہب مغربی یہ سب مسلمانوں کے دشمن ہیں لیکن حیرت ہے کہ یہ سب سعودی نجدیوں کے دوست، خیر خواہ اور حمایتی ہیں، انھیں سے مالی مدد لے کر اسلحے اور فوج کی مدد کا احسان رکھتے ہیں اور دھیرے دھیرے اپنی طاقت کو آگے بڑھا کر مکمل قبضے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ مگر امریکہ کے ٹکڑوں پر پلنے والے اور ان کو اپنی قدرتی دولت سے پالنے والے نجدی محض اپنی حکومت کی فکر میں ہیں کہ وہ باقی رہے اور بس۔ یہودی حکومت اسرائیل بھی انھیں کی شہ پر پروان چڑھ رہی ہے، جبھی تو اس کے خلاف نہ امریکہ کچھ کر رہا ہے، نہ برطانیہ اور نہ ہی سعودی نجدی۔

مہتمم دار العلوم قادریہ، چریا کوٹ، مئو

حیرت اورافسوس ہے کہ کل جو مسلمان صدام حسین زندہ باد کا نعرہ لگاتے تھکتے نہیں تھے، آج وہ سقوطِ بغداد اور شکستِ صدام کے بعد خاموش ہیں۔اس سے ہمیں اپنی ایمانی حرارت کا اندازہ لگانا چاہیے کہ وہ کس قدر سرد پڑ گئی ہے، آج کی ہماری خاموشی ہی امریکہ کو پوری دنیا پر چودھراہٹ کا حوصلہ دے رہی ہے۔ایک طرف تو امریکہ نے عراق پر دوبار حملہ کر کے اس کو تہس نہس کیا اور پھر اس پر قبضہ کر کے بیٹھ گیا۔ دوسرے، عراق کے بعد افغانستان کی جانب قدم بڑھایا اور اس کا بھی تیاپانچا کر ڈالا اور آج وہاں بھی امریکہ ہی قابض ہے۔دہشت گردی ختم کرنے کا نعرہ لگا کر امریکہ پوری دنیا کو خوف زدہ کیے ہوئے ہے اور اپنی چودھراہٹ کا سکہ قائم کرنا چاہتا ہے جب کہ وہ خود دنیا کا سب سے بڑا دہشت گرد ہے۔دنیا میں جہاں بھی کوئی دھماکہ ہوتا ہے، بس مسلمانوں کو موردِ الزام ٹھہرایا جاتا ہے، جب کہ یہ دھماکہ کرنے والے کون ہیں، کیوں ایسا کرتے ہیں، اس کا آج تک صحیح پتہ نہیں چلایا جاسکا۔ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ خود دشمن کی سازش ہو کہ اپنا کچھ نقصان سہ کر مسلمانوں کو بدنام کیا جائے۔امریکہ کے پاس صحیح جانچ، صداقت اور شہادت نام کی کوئی چیز نہیں، قیاسات پر ساری عمارت کھڑی کی جاتی ہے اور خیالات کو حقیقت کا جامہ پہنا کر پیش کیا جاتا ہے۔

اس وقت بعض دانش ور یہ کہہ رہے ہیں کہ صدام حسین سے بڑا مجرم تو بش ہے۔جس نے بغیر تحقیق وثبوت عراق پر حملہ کر کے لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔لہٰذا بش پر اس سے بڑا مقدمہ ہونا چاہیے اور لاکھوں انسانوں کے قاتل کی جو سزا ہے وہ بش کو دی جانی چاہیے۔لیکن اس طرح کے صحیح و درست مطالبات کو میڈیا والے کسی کونے گوشے میں دے ڈالتے ہیں۔جب کہ صدام حسین کا مجرم ہونا تو قابلِ تحقیق ہے، لیکن بش کا مجرم ہونا تو طشت از بام ہو چکا ہے۔ پوری دنیا اس کی گواہ ہے، اور آج ہر طرف انصاف پسند انسان اس پر لعنت بھیج رہے ہیں، اس لیے اس وقت کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ عالمی پیمانے پر بش کے خلاف احتجاج کیا جائے، اس پر عالمی عدالت میں مقدمے کی مانگ کی جائے، اور اس کو سزائے قتل دینے کا مطالبہ کیا جائے اور ہر طرف امریکہ اور جارج بش کے خلاف احتجاجات ہوں اور تمام مسلم ممالک پر وہاں کے عوام زور ڈالیں کہ امریکہ کا اس وقت تک مکمل بائیکاٹ کیا جائے، جب تک کہ امریکہ، عراق و افغانستان کو اپنے ظالمانہ چنگل سے آزاد نہ کرے۔

حدیث شریف میں آیا ہے: «افضل الجهادِ كَلِمَةُ حَقٍ عِندَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ.» ظالم بادشاہ کے پاس حق بات کا کہنا افضل جہاد ہے۔

اس وقت دنیا میں سب سے ظالم حکومت امریکہ کی ہے اور سب سے بڑا ظالم بش ہے۔جو ظالم ابن ظالم بھی ہے۔آج ضرورت ہے حسینی کردار کی، اعلائے کلمۂ حق کے جذبۂ صادق کی۔افسوس کہ زلزلے، طوفان، سیلاب وغیرہ آفاتِ سماوی ہمیں بیدار کرنے کے لیے بار بار ہمارے دروازوں پر دستک دے رہی ہیں، لیکن ہم ہیں کہ بیدار ہونے کا نام ہی نہیں لیتے۔اگر اس بار بار کی وارننگ کے بعد بھی ہم بیدار نہ ہوئے تو اب قیامت کا طوفان اور زلزلۃ الساعۃ ہی ہماری آنکھیں کھولے گا۔لیکن اس وقت طوفان سر سے گزر چکا ہوگا۔

ایک طرف تو آج ہمیں اعلائے حق کی ضرورت ہے، دوسری طرف ہمیں اپنے اعمال و کردار میں سدھار لانا بھی ضروری ہے۔مسلمان جن خرافات و بدعات کا شکار ہیں، ان سے جلد سے جلد توبہ و اجتناب بھی کرنا ناگزیر ہے۔ماہِ محرم الحرام کو لے لیجیے، اس پاک مہینے میں کتنی ناپاک حرکتیں ہم کرتے ہیں، ان کا شمار کرنا بھی امر دشوار ہے۔امام عالی مقام حسین پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے اعوان و انصار اور دیگر اہلِ بیتِ اطہار نے گلشن اسلام کو لہلہانے اور دین مصطفیٰ کو چمکانے کے لیے جان مال کی قربانی دینے سے بھی دریغ نہ کیا اور ہم ہیں کہ ان کے غم میں نالہ و شیون کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہیں۔خرافات و بدعات میں مشغول ہو کر اسلام کو بھی بدنام کر رہے ہیں اور اہل اسلام کو بھی۔لہٰذا ماہِ محرم الحرام شریف کیا ہے؟ یومِ عاشورا کی کیا اہمیت ہے اور حضرت امام عالی مقام نے ہمیں کیا درسِ عمل دیا ہے، ان گوشوں کو اجاگر کرنے اور پیغامِ حق کو عام کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، امید کہ قارئین کرام اور دردمندانِ اسلام و عقیدت مندانِ امام عالی مقام ان معروضات پر غور کریں گے اور خود بھی عمل کریں گے اور دوسرے اسلامی بھائیوں کو بھی عمل کی دعوت دیں گے۔اللہ تعالیٰ توفیق عمل عطا فرمائے، آمین۔

ماہِ محرم ...

محرم کا مہینہ بڑا مبارک اور محترم مہینہ ہے۔اسلامی سال کا یہ پہلا مہینہ اپنے اندر بڑی عظیم یادگاریں رکھتا ہے۔اس کی دسویں تاریخ، جس کو یومِ عاشورا کہتے ہیں، بڑی اہمیت کی حامل ہے۔محرم ہی کی دسویں تاریخ جمعہ کے دن حضرت نوح علیہ السلام اپنی کشتی سے زمین پر تشریف لائے اور اسی دن دسویں تاریخ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے ظلم سے نجات پائی جب کہ فرعون غرق ہوگیا، اسی دسویں محرم اور جمعہ کے دن قیامت آنے والی ہے۔اکسٹھ ہجری دسویں محرم جمعہ کے دن ہی

شہزادۂ رسول جگر گوشۂ بتول اور گلشن اسلام کے مہکتے پھول حضرت سیدنا امام عالی مقام حسین بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کربلا کی تپتی ہوئی سر زمین پر شہادت کا جام پیا۔اسی لیے جب ہر سال یہ تاریخ آتی ہے، محبانِ اہلِ بیت اس واقعہ فاجعہ کو یاد کر کے غم واندوہ میں ڈوب جاتے ہیں۔طبعی طور سے اگر واقعاتِ کربلا سن کر یا یاد کر کے غم تازہ ہو جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔البتہ قصداً سوگ منانا، ماتم ونوحہ کی فضا قائم کرنا اور سینہ کوبی کرنا کسی طرح شرعاً جائز نہیں۔ہوسکے تو نویں دسویں دن روزہ رکھ کر اللہ کو راضی کرنے کی کوشش کریں، صدقہ وخیرات کریں، شہدائے کربلا و دیگر صحابہ اہل بیت کو ایصالِ ثواب کریں۔اہل بیت کے فضائل کی مجالس قائم کریں اور سچے واقعاتِ کربلا بیان کریں اور سنیں۔

اعلیٰ حضرت مجدد دین وملت امام احمد رضا محدث بریلوی قدس سرہ کے خلیفہ وتلمیذ صدر الشریعہ بدر الطریقہ فقیہ اعظم حضرت مولانا شاہ محمد امجد علی اعظمی قادری رضوی قدس سرہ مصنف بہار شریعت ارشاد فرماتے ہیں:

”ماہ محرم میں دس دنوں تک خصوصاً دسویں کو حضرت سیدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ و دیگر شہدائے کربلا کو ایصال ثواب کرتے ہیں کوئی شربت پر فاتحہ دلاتا ہے، کوئی شیرینی پر فاتحہ، کوئی مٹھائی پر، کوئی روٹی گوشت پر۔جس پر چاہو فاتحہ دلاؤ جائز ہے، ان کو جس طرح ایصال ثواب کرو مندوب (پسندیدہ) ہے۔بہت سے (لوگ) پانی اور شربت کی سبیل لگاتے ہیں، جاڑوں میں چائے پلاتے ہیں، کوئی کھچڑا پکواتا ہے، جو کارِ خیر کرو اور ثواب پہنچاؤ، ہوسکتا ہے۔ان سب کو ناجائز نہیں کہا جاسکتا۔

بعض جاہلوں میں مشہور ہے کہ محرم میں سوائے شہدائے کربلا کے دوسروں کی فاتحہ نہ دلائی جائے، ان کا یہ خیال غلط ہے، جس طرح دوسرے دنوں میں سب کی فاتحہ ہوسکتی ہے، ان دنوں میں بھی ہوسکتی ہے۔“

(بہارِ شریعت، حصہ:۱۶، ص: ۲۴۴، ۲۴۵، فاروقیہ بک ڈپو، دہلی)

مجلس ذکر شہادت ...

حضرت صدر الشریعہ اعظمی علیہ الرحمۃ والرضوان، ماہ محرم شریف کی مجالس کے بارے میں رقم طراز ہیں:

”عشرۂ محرم میں مجلس منعقد کرنا اور واقعات کربلا بیان کرنا جائز ہے، جب کہ روایات، صحیح بیان کی جائیں۔ان واقعات میں صبر وتحمل، رضا و تسلیم کا مکمل درس ہے اور پابندی احکامِ شریعت و اتباعِ سنت کا زبردست عملی ثبوت ہے کہ دینِ حق کی حفاظت میں تمام اعزہ واقربا و رفقا اور خود اپنے کو راہِ خدا میں قربان کیا اور جزع وفزع کا نام بھی نہ آنے دیا۔مگر اس مجلس میں صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا بھی ذکر خیر ہو جانا چاہیے تاکہ اہلِ سنت اور شیعوں کی مجالس میں فرق و امتیاز رہے۔“(بہارِ شریعت، حصہ:۱۶، ص:۲۴۷)

تعزیہ داری...

دسویں محرم میں برصغیر ہند و پاک و بنگلہ دیش میں یادگار امام کے نام پر تعزیہ داری کی جو رسم جاری ہے وہ انتہائی غلط شکل اختیار کر گئی ہے۔مقاماتِ مقدسہ اور روضۂ امام عالی مقام کا محض صحیح نقشہ بنوا کر بطور یادگار رکھا جاتا تو اس میں کوئی حرج نہ تھا۔جیسے کہ کعبۂ معظمہ اور روضۂ رسول کے نقشے ہم بناتے اور گھروں میں تبرکاً رکھتے ہیں۔مگر افسوس! عقیدت کے غلو نے تعزیہ کو مایۂ بدعات بنا کر رکھ دیا۔حتی کہ اب تو روضۂ امام کا صحیح نقشہ بھی باقی نہ رہا۔طرح طرح کی نئی تراش خراش نے تعزیہ کو ایک نئے نقشے میں تبدیل کر دیا ہے، لہٰذا اب حد سے تجاوز کی بنیاد پر اس کو کسی طرح جائز نہیں قرار دیا جاسکتا۔اس سلسلے میں جو بے راہ رویاں در آئی ہیں ان کو حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمہ نے اس طرح بیان کیا ہے:

”تعزیہ داری کہ واقعات کربلا کے سلسلے میں طرح طرح کے ڈھانچے بناتے اور ان کو حضرت سیدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے روضۂ پاک کی شبیہ کہتے ہیں۔کہیں تخت بنائے جاتے ہیں، کہیں ضریح (قبر) بنتی ہے اور علم اور شدے نکالے جاتے ہیں۔ڈھول تاشے اور قسم قسم کے باجے بجائے جاتے ہیں۔تعزیوں کا بہت دھوم دھام سے گشت ہوتا ہے۔آگے پیچھے ہونے میں جاہلیت کے سے جھگڑے ہوتے ہیں، کبھی درخت کی شاخیں کاٹی جاتی ہیں، کہیں چبوترے کھدوا دیے جاتے ہیں۔تعزیوں سے منتیں مانی جاتی ہیں، سونے چاندی کے علم چڑھائے جاتے ہیں، ہار پھول ناریل چڑھاتے ہیں، وہاں جوتے پہن کر جانے کو گناہ جانتے ہیں، بلکہ اس شدت سے منع کرتے ہیں کہ گناہ پر بھی ایسی ممانعت نہیں کرتے۔چھتری لگانے کو بہت برا جانتے ہیں۔تعزیوں کے اندر دو مصنوعی قبریں بناتے ہیں، ایک پر سبز غلاف اور دوسرے پر سرخ غلاف ڈالتے ہیں، سبز غلاف والی کو حضرت سیدنا امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر اور سرخ غلاف والی کو حضرت سیدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر یا شبیہ قبر بتاتے ہیں اور وہاں شربت، مالیدہ وغیرہ پر فاتحہ دلواتے ہیں۔یہ تصور کر کے کہ حضرت امام عالی مقام کے روضہ اور مواجہہ اقدس میں فاتحہ دلا رہے ہیں، پھر یہ

تعزیے دسویں تاریخ کو مصنوعی کربلا میں لے جا کر دفن کرتے ہیں۔ گویا یہ جنازہ تھا جسے دفن کر آئے، پھر تیجہ، دسواں، چالیسواں سب کچھ کیا جاتا ہے اور ہر ایک خرافات پر مشتمل ہوتا ہے۔

حضرت قاسم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مہندی نکالتے ہیں گویا ان کی شادی ہو رہی ہے اور مہندی رچائی جائے گی۔

اور اس تعزیہ داری کے سلسلے میں کوئی پیک بنتا ہے جس کے کمر سے گھنگھرو بندھے ہوتے ہیں گویا حضرت امام عالی مقام کا قاصد اور ہرکارہ ہے جو یہاں سے خط لے کر ابن زیاد یا یزید کے پاس جائے گا، وہ ہرکاروں کی طرح بھاگا بھاگا پھرتا ہے۔

کسی بچہ کو فقیر بنایا جاتا ہے، اس کے گلے میں جھولی ڈالتے اور گھر گھر اس سے بھیک منگواتے ہیں۔

کہیں سقہ (بھشتی) بنایا جاتا ہے۔ چھوٹی سی مشک اس کے کندھے سے لٹکتی ہے گویا یہ دریائے فرات سے پانی بھر کر لائے گا۔ کسی علم پر مشک لٹکتی ہے اور اس میں تیر لگا ہوتا ہے۔ یہ حضرت عباس علم بردار ہیں کہ فرات سے پانی لا رہے ہیں اور یزیدیوں نے مشک کو تیر سے چھید دیا ہے۔ اس قسم کی بہت سی باتیں کی جاتی ہیں، یہ سب لغو خرافات ہیں۔ ان سے ہرگز سیدنا حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ خوش نہیں ہوں گے۔

یہ تم خود غور کرو کہ انھوں نے احیائے دین و سنت کے لیے یہ زبردست قربانیاں دیں اور تم نے معاذ اللہ اس کو بدعات کا ذریعہ بنالیا۔

بعض جگہ اس تعزیہ داری کے سلسلے میں براق بنایا جاتا ہے، جو عجیب قسم کا مجسمہ ہوتا ہے کہ کچھ حصہ انسانی شکل کا ہوتا ہے اور کچھ حصہ جانور کا سا، شاید یہ حضرت امام عالی مقام کی سواری کے لیے ایک جانور ہوگا۔

کہیں دلدل بنتا ہے کہیں بڑی بڑی قبریں بنتی ہیں۔ بعض جگہ آدمی ریچھ، بندر، لنگور بنتے ہیں اور کودتے پھرتے ہیں، جن کو اسلام تو اسلام انسانی تہذیب بھی جائز نہیں رکھتی، ایسی بری حرکت کو اسلام ہرگز جائز نہیں رکھتا۔ افسوس! کہ محبت اہلِ بیت کرام کا دعویٰ اور ایسی بے جا حرکتیں۔ یہ واقعہ تمہارے لیے نصیحت تھا اور تم نے اس کو کھیل تماشا بنالیا۔

اسی سلسلے میں نوحہ و ماتم بھی ہوتا ہے اور سینہ کوبی ہوتی ہے۔ اتنے زور زور سے سینہ کوٹتے ہیں کہ ورم ہو جاتا ہے، سینہ سرخ ہو جاتا ہے بلکہ بعض جگہ زنجیروں اور چھریوں سے ماتم کرتے ہیں کہ سینے سے خون بہنے لگتا ہے۔

تعزیوں کے پاس مرثیہ پڑھا جاتا ہے اور تعزیہ جب گشت کو نکلتا ہے اس وقت بھی اس کے آگے مرثیہ پڑھا جاتا ہے۔ مرثیہ میں غلط واقعات نظم کیے جاتے ہیں۔ اہل بیت کرام کی بے حرمتی اور بے صبری اور جزع فزع کا ذکر کیا جاتا ہے اور چوں کہ اکثر مرثیہ رافضیوں کے ہی ہیں، بعض میں تبرا بھی ہوتا ہے، مگر اسے رو میں سنی بھی بے تکلف پڑھ جاتے ہیں اور انھیں اس کا خیال بھی نہیں ہوتا کہ کیا پڑھ رہے ہیں۔ یہ سب ناجائز اور گناہ کے کام ہیں۔

اظہارِ غم کے لیے سر کے بال بکھیرتے ہیں، کپڑے پھاڑتے اور سر پر خاک ڈالتے اور بھوسا اڑاتے ہیں۔ یہ بھی ناجائز اور جاہلیت کے کام ہیں۔ ان سے بچنا بہت ضروری ہے۔ احادیث میں ان سب کی ممانعت آئی ہے۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ ایسے امور سے پرہیز کریں اور ایسے کام کریں جن سے اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم راضی ہوں کہ یہی نجات کا راستہ ہے۔

تعزیوں اور علم کے ساتھ بعض لوگ لنگر لٹاتے ہیں۔ یعنی روٹیاں یا بسکٹ اور کوئی چیز اونچی جگہ سے پھینکتے ہیں۔ یہ ناجائز ہے کہ رزق کی سخت بے حرمتی ہوتی ہے۔ یہ چیزیں کبھی نالیوں میں بھی گرتی ہیں اور اکثر لوٹنے والوں کے پاؤں کے نیچے بھی آتی ہیں اور بہت کچھ کچل کر ضائع ہوتی ہیں۔ اگر یہ چیزیں انسانیت کے طریق پر فقرا کو تقسیم کی جائیں تو بے حرمتی بھی نہ ہو اور جن کو دیا جائے انھیں فائدہ بھی پہنچے مگر وہ لوگ اس طرح لٹانے ہی کو اپنی نیک نامی تصور کرتے ہیں۔ (بہارِ شریعت، حصہ:۱۶، ص:۲۴۷-۲۴۹)

دیکھا آپ نے بارگاہِ رضا کے اس پروردہ اور فیض یافتہ نے کیسا بے باک قلم چلایا اور دو ٹوک فیصلہ سنایا ہے۔ نہ اپنوں کی پروائی ہے نہ غیروں کا خوف کھایا ہے۔ سچے عالم دین کا یہی شیوہ ہوتا ہے۔ اب ذرا مجدد ملت مصلح امت سرکار اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی قدس سرہ العزیز کے ارشادات و فتاویٰ بھی تعزیہ و متعلقات تعزیہ کے بارے میں ملاحظہ کریں کہ وہ دردمند ملت، قوم کی فلاح و بہبود کے لیے کیا کیا اقدام فرماتے ہیں اور بدعات و خرافات پر کیسی کاری ضرب لگاتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

«تعزیہ کی اصل اس قدر تھی کہ روضہ پرنور حضور شہزادۂ گلگوں قبا حسین شہید ظلم و جفا صلوٰت اللہ تعالیٰ وسلامہ علیٰ جدہ الکریم وعلیہ کی صحیح نقل بنا کر بہ نیت تبرک، مکان میں رکھنا، اس میں شرعاً کوئی حرج نہ تھا کہ تصویر، مکانات وغیرہ ہر غیر جان دار کی بنانا رکھنا سب جائز۔ اور ایسی چیزیں کہ معظمان دین کی طرف منسوب ہو کر عظمت پیدا کریں ان کی امثال (شکلیں) بہ نیت تبرک پاس رکھنا قطعاً جائز جیسے صدہا سال سے طبقۃً بعد طبقۃٍ (یکے بعد دیگرے) ائمۂ دین وعلمائے معتمدین نعلین شریف حضور سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشے بناتے اور ان کے فوائد جلیلہ و منافع جزیلہ میں مستقل

رسالے تصنیف فرماتے ہیں، جسے اشتباہ (شبہہ) ہو امام علامہ تلمسانی کی فتح المتعال وغیرہ مطالعہ کرے۔ مگر جہال بے خرد (بے عقل جاہلوں) نے اس اصل جائز کو بالکل نیست و نابود کر کے صدہا خرافات تراشیں کہ شریعت مطہرہ سے الامان الامان کی صدائیں آئیں۔

اول تو نقش تعزیہ میں روضۂ مبارک کی نقل ملحوظ نہ رہی۔ ہر جگہ نئی تراش، نئی گڑھت، جسے اس نقل سے کچھ علاقہ نہ نسبت، پھر کسی میں پریاں، کسی میں براق کسی میں اور بے ہودہ طمطراق (دھوم دھام) پھر کوچہ بہ کوچہ، دشت بہ دشت، اشاعت غم کے لیے ان کا گشت اور ان کے گرد سینہ زنی اور ماتم سازی کی شور افگنی۔ کوئی ان تصویروں کو جھک جھک کر سلام کر رہا ہے، کوئی مشغولِ طواف، کوئی سجدے میں گرا ہے، کوئی ان مایۂ بدعات (سامان بدعات) کو معاذ اللہ جلوہ گاہ حضرت امام علیٰ جدہ وعلیہ الصلاۃ والسلام سمجھ کر اس ابرک پنی سے مرادیں مانگتا، منتیں مانتا ہے، حاجت روا جانتا ہے۔ پھر باقی تماشے، باجے، تاشے، مردوں عورتوں کا راتوں کو میل (اختلاط) اور طرح طرح کے بے ہودہ کھیل ان سب پر طرہ ہیں۔ غرض عشرۂ محرم الحرام کہ اگلی شریعتوں سے اس شریعتِ پاک تک نہایت بابرکت و محل عبادت ٹھہرا ہوا تھا۔ ان بے ہودہ رسوم نے جاہلانہ اور فاسقانہ میلوں کا زمانہ کر دیا۔ پھر وبالِ ابتداع (بدعت نکالنے کے وبال) کا وہ جوش ہوا کہ خیرات کو بھی بطور خیرات نہ رکھا۔ ریا و تفاخر علانیہ ہوتا ہے، پھر وہ بھی یہ نہیں کہ سیدھی طرح محتاجوں کو دیں بلکہ چھتوں پر بیٹھ کر پھینکیں گے، روٹیاں زمین پر گر رہی ہیں، رزق الٰہی کی بے ادبی ہوتی ہے، پیسے دیتے ہیں، گر کر غائب ہوتے ہیں، مال کی اضاعت (بربادی) ہو رہی ہے مگر نام تو ہو گیا کہ فلاں صاحب لنگر لٹا رہے ہیں۔

اب بہارِ عشرہ کے پھول کھلے، تاشے باجے بجتے چلے، طرح طرح کے کھیلوں کی دھوم، بازاری عورتوں کا ہر طرف ہجوم، شہوانی میلوں کی پوری رسوم، جشن یہ کچھ اور اس کے ساتھ خیال وہ کچھ کہ گویا یہ ساختہ تصوریں بعینہا حضرات شہدا رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے جنازے ہیں۔ (پھر) کچھ نوچ اتار، باقی توڑ تاڑ دفن کر دیے۔ یہ ہر سال اضاعت مال (مال ضائع کرنے) کے جرم و وبال جداگانہ رہے۔ اللہ تعالیٰ صدقہ حضرات شہدائے کربلا علیہم الرضوان والثنا کا ہمارے بھائیوں کو نیکیوں کی توفیق بخشے اور بری باتوں سے توبہ عطا فرمائے۔ آمین۔

اب کہ تعزیہ داری اس طریقۂ نامرضیہ (ناپسندیدہ طریقہ) کا نام ہے قطعاً بدعت و ناجائز و حرام ہے۔ ہاں اگر اہلِ اسلام صرف جائز طور پر حضرات شہدائے کرام علیہم الرضوان التام کی ارواحِ طیبہ کو ایصالِ ثواب کی سعادت پر اقتصار (اکتفا) کرتے تو کس قدر خوب و محبوب تھا۔ اور اگر نظرِ شوق و محبت میں نقل روضۂ انور کی بھی حاجت تھی تو اسی قدر جائز پر قناعت کرتے کہ صحیح نقل کو بغرض تبرک و زیارت اپنے مکانوں میں رکھتے اور اشاعتِ غم و تصنع الم و نوحہ زنی و ماتم کنی و دیگر امور شنیعہ و بدعات قبیحہ سے بچتے۔ اس قدر میں بھی کوئی حرج نہ تھا۔ مگر اب ایسی نقل میں بھی اہلِ بدعت سے ایک مشابہت اور تعزیہ داری کی تہمت کا خدشہ اور آئندہ اپنی اولاد یا اہل اعتقاد (عقیدت مندوں) کے لیے ابتلائے بدعات (بدعات میں مبتلا ہونے) کا اندیشہ ہے اور حدیث میں آیا: "اِتَّقُوْا مَوَاضِعَ التُّهَمِ۔" (تہمت کی جگہوں سے بچو) اور وارد ہوا: «مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلَا يَقِفْ مَوَاقِفَ التُّهَمِ» (جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہیے کہ تہمت کی جگہوں پر کھڑا بھی نہ ہو۔) لہٰذا روضۂ اقدس حضور سید الشہدا کی ایسی تصویر بھی نہ بنائے بلکہ صرف کاغذ کے صحیح نقشے پر قناعت کرے اور اسے بہ قصد تبرک بے آمیزش منہیات (ممنوع کاموں کی آمیزش کے بغیر) اپنے پاس رکھے، جس طرح حرمین محترمین سے کعبۂ معظمہ اور روضۂ عالیہ کے نقشے آتے ہیں، یا دلائل الخیرات شریف میں قبور پرنور کے نقشے لکھے ہیں۔»

(فتاویٰ رضویہ، ج:۹، ص:۳۵، ۳۶ - رضا اکیڈمی ممبئی)

ماہ محرم خاص کر دسویں محرم میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے اس پر روشنی ڈالتے ہوئے امام احمد رضا قدس سرہ اپنے فتاویٰ میں ارشاد فرماتے ہیں:

مسلمانوں کو ان ایام میں صدقات و خیرات، مبرات و حسنات کی کثرت چاہیے۔ خصوصاً روزے خصوصاً روز عاشورا کا کہ سال بھر کے روزوں کا ثواب اور ایک سالِ گزشتہ کے گناہوں کی معافی ہے۔ کما ثبت فی الحدیث الصحیح۔ (جیسا کہ حدیث صحیح سے ثابت ہے) اور بہتر یہ ہے کہ نویں دسویں دونوں کا روزہ رکھے۔

یہ محرم الحرام کے مبارک ماہ میں بدعات و خرافات کے خلاف امام احمد رضا قادری محدث بریلوی کا قلمی جہاد ہے۔ اسے وہ لوگ بھی پڑھیں اور حقیقت کا اعتراف کریں جو امام احمد رضا قدس سرہ کے بارے میں غلط فہمیوں کے شکار ہیں اور اس مجدد برحق کے خلاف غلط پروپیگنڈے بھی کرتے پھرتے ہیں۔ کیسی سچی، سیدھی باتیں اس امام برحق نے کہی ہیں۔ ان کو بار بار پڑھنا چاہیے اور اس کے مطابق عمل بھی کرنا چاہیے۔

شعاعیں

اسلامی نظامِ حیات اور اس کے تقاضے

مولانا محمد اسلم رضا قادری

اسلام نے اپنے آئین و اصول میں "صالحیت" کا ایک ایسا نظامِ عمل تشکیل دیا ہے جس کی انفرادیت وافادیت اور جامع حیثیت کا جواب نہیں۔ اس دستور کو اپنا کر یقیناً ہر شخص ایک باوقار اور خوش گوار زندگی گزار سکتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ قوم مسلم اس کے آئین واصول کو عملی جامہ پہنا کر نماز، روزہ، زکوٰۃ کو مکمل طریقے سے ادا کرتے ہوئے برائیوں اور بداعمالیوں سے پرہیز کرے۔ اپنے کردار وعمل، قول وفعل کو اسلامی بنائے، اپنی وضع قطع سدھارے، سنوارے تو ہمارے سروں سے یہ انحطاط وزوال کا بوجھ اتر سکتا ہے اور ہماری زندگیاں کامیابیوں سے ہم کنار ہوسکتی ہیں۔ معاشرے سے برائیوں مثلاً جوا، شراب، جھوٹ اور بدکاری کا خاتمہ اسی وقت ممکن ہے جب ہماری ملت کا ایک ایک فرد اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے اطاعتِ الٰہی اور اتباعِ رسول کا عملی نمونہ بن جائے، نیز نیکی کی دعوت دینے والا اور برائی سے روکنے کا عزم کر لے۔ بعدہ اپنے چال ڈھال، گفتار ورفتار سے اسلام کا شیدائی نظر آئے تب قومِ مسلم عروج و ارتقا کی منزلیں طے کرسکتی ہے اور اپنے کھوئے ہوئے وقار وناموس کو پا سکتی ہے۔ برا ہو ہماری اس عیش وطرب کی زندگی کا جس نے ہمیں اپنے خالق ورازق کی اطاعت وبندگی سے دور کر کے غیروں کی وضع قطع، تہذیب وتمدن کا غلام بنا کر رکھ دیا ہے جس نے ہماری فکروں اور دماغوں سے اسلامی تہذیب، اسلامی کردار وعمل اور سنت رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی لگن اور رغبت کو نکال دیا اور دنیاداروں، فلمی ہیروؤں سی وضع قطع بنانے پر مجبور کردیا۔ اسی احساس وفکر کا اظہار کرتے ہوئے امام النحو حضرت علامہ سید غلام جیلانی میرٹھی قدس سرہ تحریر کرتے ہیں:

"دنیا کی ہر قوم اپنی مذہبی معاشرت اور اپنے پیشوا کے طرزِ عمل کی مضبوطی سے پابند رہتی ہے بلکہ اپنی معاشرت، اپنا تمدن، اپنے طریقے، دوسری اقوام میں رائج کرنے کے لیے ہر قوم نہ صرف مالی ایثار بلکہ جانی قربانی بھی کر گزرتی ہے۔ مگر بڑے شرم کی بات ہے کہ مسلم کہلائیں اور اسلامی معاشرت، اسلامی آداب ترک کرتے جائیں، انگریز کو دشمنِ اسلام سمجھیں، مگر معاشرت میں انگریز کو اپنے اوپر مسلط اس درجہ کرلیا ہے کہ بول چال میں انگریزی انداز مرغوب، کھانے پینے میں انگریزی طریقے محبوب، اٹھنے بیٹھنے میں انگریزی آداب مطلوب، یہاں تک کہ شکل وصورت میں انگریز نمودار، اولاد کی تعلیم وتربیت میں انگریزی اصول درکار، مستورات کے لباس اور زیب وزینت میں میم صاحب کے اطوار پسند ہیں۔

آہ! مقامِ غیرت ہے کہ زبان سے خدا اور رسول کی محبت کا دم بھریں اور عمل میں دشمنانِ اسلام کا ساتھ دیں، کیا اہلِ محبت کا شیوہ یہی ہے؟ اے پیارے بھائیو! اور اے اسلام کے شیدائیو! سنو اور خوب غور سے سنو کہ شہنشاہِ مدینہ نے اپنی زندگی کے لیل ونہار اس طرح گزارے کہ دنیوی مشاغل اور ضروریاتِ زندگی کو انجام دیتے وقت بھی یادِ الٰہی سے غفلت نہ ہوئی۔" (نظامِ شریعت، ص: ۳-۴)

مزید علامہ موصوف مسلمانوں کے ناگفتہ بہ حالات کو دیکھ کر اپنے درد کو کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں:

"قومِ مسلم کی پستی کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ اس نے اپنے قومی امتیاز کو ترک کردیا۔ دوسروں کو اپنے اندر جذب کرنے کے بجائے خود ان کے اندر جذب ہوگئی۔ ہر قوم کی بقا اس کے امتیازات کے ساتھ وابستہ ہے۔ امتیازات کے ختم ہونے سے قوم فنا ہوجاتی ہے۔ دوسری اقوام کی نگاہوں میں اس کی وقعت باقی نہیں رہتی۔ اس نکتہ پر متنبہ کرنے کے لیے سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: من تشبہ بقوم فھو منھم۔ یعنی جو شخص جس قوم کے ساتھ مشابہت اختیار کرے گا اسی قوم میں شمار کیا جائے گا، خواہ مشابہت اعمال میں ہو یا اخلاق میں، یا لباس میں یا کسی اور چیز میں۔" (ایضاً، ص: ۳۳)

ہمارے انہی حالات سے متاثر ہو کر شاعر مشرق ڈاکٹر محمد اقبال نے کہا تھا ؎

کون ہے تارکِ آئینِ رسولِ مختار
مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار

شور ہے ہو گئے دنیا سے مسلماں نابود
ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود
کس کی نظروں میں سمایا ہے شعارِ اغیار
ہوگئی کس کی نظر طرزِ سلف سے بیزار
وضع میں تم ہو نصارا تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنھیں دیکھ کے شرمائیں یہود
قلب میں سوز نہیں، روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغامِ محبت کا تمھیں پاس نہیں
یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

نظامِ صالحیت قرآن کی روشنی میں: ذیل کی سطروں میں ان چند آیاتِ قرآنیہ کا ترجمہ پیش کیا جارہا ہے جن میں بندگانِ خدا کو "اعمالِ صالحہ" کی تعلیم وترغیب دیتے ہوئے انھیں خوش خبریاں اور بشارتیں سنائی گئی ہیں۔ ارشادِ خداوندی ہے:

"اور خوش خبری دے انھیں جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے کہ ان کے لیے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں رواں جب انھیں ان باغوں سے کوئی پھل کھانے کو دیا جائے گا تو (صورت دیکھ کر) کہیں گے یہ تو وہی رزق ہے جو ہمیں پہلے ملا تھا اور وہ (صورت میں) ملتا جلتا انھیں دیا جائے گا اور ان کے لیے ان باغوں میں ستھری بیبیاں ہیں، اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔" (البقرہ: ۲/ ۲۵، کنز الایمان)

اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: "ہاں کیوں نہیں جس نے اپنا منہ جھکایا اللہ کے لیے اور وہ نیکوکار ہے تو اس کا نیگ اس کے رب کے پاس ہے اور انھیں نہ کچھ اندیشہ ہو نہ کچھ غم۔" (البقرہ: ۲/ ۱۱۲)

ارشادِ باریِ تعالیٰ ہے: "بے شک جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے، فردوس کے باغ ان کی مہمانی ہے، وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے، ان سے جگہ بدلنا نہ چاہیں گے۔" (الکہف: ۱۸/ ۱۰۷)

خداوند قدوس کا فرمان ہے: "اور میں نے جن اور آدمی اپنے ہی لیے بنائے کہ میری عبادت کریں۔" (الذٰریٰت: ۵۱/ ۵۶)

اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے: "بے شک جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے ان کا رب ان کے ایمان کے سبب انھیں راہ دے گا، ان کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی نعمت کے باغوں میں۔" (یونس: ۱۰/ ۸)

قادرِ مطلق کا ارشاد ہے: "اور نماز برپا رکھو اور زکوٰۃ دو اور رسول کی فرماں برداری کرو، اس امید پر کہ تم پر رحم ہو۔" (النور ۲۴/ ۵۶)

معبودِ حقیقی کا فرمان ہے: "اور وہ جو اللہ پر ایمان لائے اور اچھا کام کرے، وہ اسے باغوں میں لے جائے گا جن کے نیچے نہریں ہیں جن میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں۔ بے شک اللہ نے اس کے لیے اچھی روزی رکھی۔" (الطلاق: ۶۵/ ۱۱، کنز الایمان)

قارئین کرام! آپ مذکورہ بالا آیات کے مطالب وتراجم پر غور کریں تو یہ بات محسوس کریں گے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جنت کو نیکوکاروں کا ٹھکانہ بنایا ہے اور انھیں ہی انعامات واکرامات سے نوازا جائے گا، کہیں جنت کی بشارت تو کہیں حورِ عین کی خوش خبری، تو اور جگہ "جنت" کے مبارک باغوں کے میوہ جات اور اس مبارک گھر کے دریچوں، اشجار واثمار کی خوشبوؤں سے مشامِ جاں کو معطر کیا جارہا ہے۔ سوچیے! یہ سب انعامات انسانوں کے واسطے ہی ہیں، لیکن ہر ایک کے لیے نہیں، ان کے لیے جو نیک اور صالح ہیں، اللہ تعالیٰ کا خوف اپنے دلوں میں رکھتے ہیں، شب وروز کو اس کی یاد میں گزارتے ہیں۔

نظامِ صالحیت حدیث کی روشنی میں: ذیل میں چند احادیث کریمہ کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جن میں نیکیاں اور اچھائیاں کرنے والوں کو اسلام نے خوش خبریاں دی ہیں۔

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے: اے ابن آدم! تو میری عبادت کے لیے (سب کام چھوڑ کر) فارغ ہو جا میں تیرا سینہ بے نیازی سے بھر دوں گا اور تیری محتاجی دور کردوں گا اور اگر تو یہ نہیں کرتا تو میں تیرے دونوں ہاتھ مشغلوں میں باندھ دوں گا اور تیری (طرف آنے والی) محتاجی کو نہیں روکوں گا۔" (ترمذی، کتاب صفۃ القیامۃ)

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضور علیہ الصلاۃ والتسلیم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے: کہ اللہ تعالیٰ نے تمام نیکیاں اور گناہ لکھ دیے پھر ان کو بیان کردیا۔ تو جو شخص کسی نیکی کا ارادہ کرے اور اس کو نہ کرسکے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے اپنے پاس سے ایک پوری نیکی کا ثواب لکھتا ہے۔ اور جو شخص کسی نیکی کا ارادہ کرتا ہے اور اس کو کرتا بھی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے دس نیکیوں سے لے کر سات سو گنا بلکہ اور کئی گنا ثواب لکھتا ہے۔ اور جو شخص کسی گناہ کا ارادہ کرتا ہے اور اس کو کرتا نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ اس

کے لیے ایک نیکی لکھتا ہے۔ اور جو شخص کسی گناہ کا ارادہ کرے اور پھر اس کو کر بھی لے تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے صرف ایک گناہ لکھتا ہے۔" (بخاری، کتاب الرقاق، باب من ھم بحسنۃ اوسیئۃ)

"حضرت عقبہ بن عامر فرماتے ہیں کہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ اس چرواہے سے بہت خوش ہوتا ہے جو پہاڑ کی چوٹی پر نماز کے لیے اذان دیتا ہے اور نماز قائم کرتا ہے اور مجھ سے ڈرتا ہے۔ میں نے اپنے اس بندے کو بخش دیا اور اس کو جنت میں داخل کر دیا۔" (ابوداؤد، کتاب الصلاۃ، باب الاذان فی السفر)

قرآن اور احادیث نبویہ میں متعدد جگہوں پر ان حضرات کے لیے بشارتیں وارد ہیں جو اللہ رب العزت سے ڈرتے ہوئے اس کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ اسے ذکر و تسبیح کے ذریعہ یاد رکھتے ہیں۔ اپنے مسلمان بھائی کے لیے اپنے دل میں خیر خواہی اور ہمدردی کا جذبہ رکھتے ہیں۔ واقعی ایسے لوگ ہی خداوند قدوس کی بارگاہ کے مقرب و محبوب ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ فسق و فجور اور گناہوں کے دَل دَل میں پھنسے ہوئے اپنے شب و روز کو گزار رہے ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ وہ تو نہایت خسارے میں ہیں۔ مولا عزوجل ہمیں نیکیوں کی توفیق دے۔ آمین۔

دیکھیے! اسلام نے کتنا ستھرا نظام قائم کیا ہے جس میں نیکی و بدی کا انجام و مآل سب کچھ عیاں ہے۔ اب فیصلہ انسان کے ہاتھ میں ہے کہ اسے کس طریقے کو اپنا کر اپنی زندگی کو عمدہ اور بہتر بنانا ہے اور کس راہ پر چل کر دنیا و عقبیٰ کو خراب کرنا ہے۔

مبلغِ اسلام حضرت علامہ سید سعادت علی قادری (پاکستان) اسلام کے اسی نظام صالحیت کی افادیت و انفرادیت اور جامعیت کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"صالحیت ایمان کا مقتضی ہے، یعنی ایمان مومن کو صالح بنانا چاہتا ہے۔ اسی لیے قرآن کریم میں ایمان کے ساتھ بار بار عمل صالح کا تذکرہ ہے جس کی تفسیر صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل اور تعلیم سے کی۔ صالحیت ہی حیات طیبہ کا ذریعہ قرار دیا گیا، اسی پر تقویٰ کے تمام مراتب کا دار و مدار ہے۔ اسی سے ولایت کی ساری منزلیں طے ہوتی ہیں۔ یہی انسان کا وہ شرف ہے جس کے باعث وہ اشرف المخلوقات ہونے کا بلند مرتبہ حاصل کرتا ہے۔ صالحیت سے زندگی پر سکون ہوتی ہے۔ یہی معاشرہ میں عزت کا ذریعہ ہے۔ اسی سے معاشی آسودگی اور خوش حالی حاصل ہوتی ہے۔ صالحیت ہی انسان کو ہر دل عزیز بناتی ہے، اسی سے قیادت و سیادت کا استحقاق ہوتا ہے، اسی سے معاشرہ میں امن و امان قائم ہوتا ہے، اسی سے افراد باہمی الفت و محبت کے بندھن میں بندھ کر ایک مضبوط قوم بنتے ہیں۔"

(یاایھا الذین اٰمنوا: ۱/۲۸۷)

اسلام اپنے ماننے والوں کا خیر خواہ بلکہ ساری کائنات کا اولین خیر خواہ ہے۔ اس حقیقت میں نہ کوئی مبالغہ ہے اور نہ کسی قسم کی زیادتی اور بڑائی، بلکہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ وہ نیک اور پرہیز گار انسان کو اس دنیا میں عزت سے سرفراز کرتا ہے اور ان نیکو کاروں اور اطاعت شعاروں کے لیے اس نے "جنت" بنائی ہے۔ ارشاد فرماتا ہے: "اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے وہی جنتی ہیں، وہ اس جنت میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔" (البقرۃ: ۲/۸۲)

حضرت پیر کرم شاہ ازہری اس آیت کریمہ کی تفسیر میں اسلام کا نظام صلاحیت اور اس کی ہمہ گیری کے متعلق لکھتے ہیں:

"قرآن حکیم یہاں نجات و بخشش کا اصل الاصول بیان فرما رہا ہے۔ نجات کا دار و مدار کسی قوم و نسب سے وابستگی پر نہیں بلکہ ایمان اور عمل صالح پر ہے۔ اسلام سے پہلے انسانیت کی تقسیم رنگ اور نسل اور وطن کی بنیادوں پر ہوتی تھی۔ ہر سفید رنگ والا خواہ اس کا نامۂ اعمال کتنا سیاہ ہو، ہر کالی رنگت والے سے برتر ہے، خواہ اس کی سیرت مہر و ماہ سے تابندہ تر ہو۔ ہر برہمن وہ کتنا جاہل اور کندۂ ناتراش ہی کیوں نہ ہو افضل ہے، ہر فاضل اور کامل سے جسے کسی برہمن ماں نے جنم نہیں دیا۔ جرمنی کی حدود میں پیدا ہونے والا خواہ وہ کتنا ہی خون خوار اور زیاں کار کیوں نہ ہو اپنی نجابت میں لاجواب ہے۔ یہ شرف اسلام کو حاصل ہے جس نے ان فاسد بنیادوں کو اکھیڑ پھینکا اور انسانیت کی تقسیم مومن اور کافر، صالح اور فاسق، نیک اور بد کی اساس پر کی اور اس طرح بلا وجہ اترانے والوں سے فخر و مباہات کے سب جھوٹے اسباب چھین لیے اور نیکی اور تقویٰ کے میدان میں سبقت لے جانے والوں کے راستے میں حائل ہونے والی سب چٹانوں کو پرزہ پرزہ کر دیا۔ (ضیاء القرآن، ۱/۷۰-۷۱)

معلوم ہوا کہ اسلام نے کامیابی و کامرانی کی اساس، تقویٰ اور پرہیز گاری کو بنایا ہے۔ اب جو بھی شخص ان چیزوں میں زیادہ ہوگا، یہ تمام بشارتیں، جنت الفردوس کے محلات اور وہاں کے باغات کی عمدہ اور لذیذ غذائیں ان کے لیے ہمہ دَم تیار ہیں۔

یوں تو دنیا کا ہر مذہب کہتا ہے اور دعوا کرتا ہے کہ ہمارا نظام زندگی ٹھوس اور عمدہ ہے لیکن اس حقیقت سے کبھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام نے ہمیں جو اصول و آئین اور دستور العمل دیا ہے اس کی مثال نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام روز بروز پھیلتا اور بڑھتا جا رہا ہے۔ لوگ اس کی روحانی اور اخلاقی تعلیمات سے متاثر ہو کر اس کے دامن میں داخل ہو رہے ہیں۔ حضرت علامہ سید سعادت علی قادری لکھتے ہیں:

"ہر قوم صالحیت پسندی کا دعوا کرتی ہے اور ہر مذہب اس کا پرچار کرتا ہے۔ لیکن اس جوہر نایاب کو حاصل کرنے کے کامیاب طریقے نہ کسی دنیاوی قانون میں پائے جاتے ہیں نہ کسی مذہبی قانون میں، جب کہ اسلام کے تمام احکام اسی کی تربیت دیتے ہیں۔ ان کی پابندی کرنے والا خود بخود پیکر صالحیت بن جاتا ہے۔ عرب کے بدوؤں اور غلامی کی زندگی بسر کرنے والوں کے حالات کا مطالعہ کیجیے، اسلام کے دامن سے وابستہ ہوتے ہی کیسے صالحین بن گئے، جو خون کے پیاسے تھے وہ دوسروں کے لیے خون بہانے لگے، جو عزت و آبرو کے لٹیرے تھے وہ دوسروں کی عزت و ناموس کے محافظ بن گئے، جو کسی کو امن و امان کی زندگی بسر نہ کرنے دیتے تھے انھوں نے دنیا کو امن و امان کے طریقے سکھائے، جو غربت و افلاس اور جہالت کی تاریکیوں میں ٹھوکریں کھاتے پھرتے تھے انھوں نے دنیا سے غربت کا خاتمہ کیا اور شمعِ علم روشن کیا۔ جو اپنے چند جانوروں کو بھی قابو نہ کر پاتے تھے انھوں نے انسانوں کے دلوں پر حکومت کی۔ جو تہذیب و تمدن کے نام سے بھی آشنا نہ تھے انھوں نے دنیا کو تہذیب و تمدن کے اصول سکھائے۔

غور کیجیے! بیٹیوں کو زندہ دفن کرنے والی قوم کو اسلام نے کیسا صالح بنا دیا کہ متقی بھی بن گئے، ولی بھی بن گئے، انسانیت کے کمال کے لیے جتنے اوصاف ہو سکتے تھے سب انھیں نصیب ہو گئے۔

صالحیت کا جو اہتمام اسلام کرتا ہے اس کی نظیر کسی مذہب یا دنیا کے کسی قانون سے پیش نہیں کی جا سکتی۔ نماز فحش اور منکر سے روکتی ہے تو روزہ ہمدردی و مساوات کے جذبات اجاگر کرتا ہے، زکوٰۃ و صدقہ دل سے مال و دولت کی محبت کو نکالتا اور معاشرے سے غربت کا خاتمہ کرتا ہے۔ حج مذہبی اخوت، اتحاد اور یک جہتی کا درس اور مرکز سے وابستگی کی دعوت دیتا ہے۔

قرآن نے شمعِ علم روشن کی تو صاحب قرآن نے دنیا کے گوشہ گوشہ میں اس کا نور پھیلانے کی تاکید کی تاکہ اس دنیا کا کوئی فرد جاہل نہ رہے۔ معلمِ صالحیت صلی اللہ علیہ وسلم جو اصولِ زندگی عطا فرمائے وہ سب کے سب حقیقت میں انسان کو زیورِ صالحیت سے آراستہ و مزین کرتے ہیں۔ والدین، اولاد، اقربا، احبا، شوہر، بیوی، بھائی، بہن، پڑوسی، حکام، ملازمین کے حقوق اور دیگر انسانوں حتی کہ جانوروں تک کے حقوق کا تعین اور ان کی ادائیگی کا حکم، صالحیت ہی کی افزائش کے لیے تو ہے۔

بڑوں کا احترام، چھوٹوں سے محبت، یتیموں کی دیکھ بھال، بیواؤں کے ساتھ ہمدردی، لوگوں سے خندہ پیشانی سے پیش آنا، غریبوں کے دکھ درد میں شریک ہونا، اہل منصب لوگوں کے مراتب کا خیال کرنا۔ ضرورت مندوں کو صدقہ و خیرات یا قرض سے امداد کرنا۔ ان جیسے تمام اعمال سے صالحیت کی نشو و نما ہوتی ہے۔ جن پر عمل کا اسلام حکم دیتا اور انھیں صالحیت کا لازمی جز قرار دیتا ہے۔

نیز اسلام ایسے تمام اعمال و اقوال سے روکتا ہے جو صالحیت کے لیے مضر اور مہلک ہیں مثلاً ترش کلامی، غصہ، حسد، کینہ، ظلم، بد دیانتی، دھوکہ دہی، جھوٹ اور بازار میں چلتے پھرتے کھانا، پینا، عام گزر گاہوں پر پیشاب وغیرہ کرنا، کسی پر ظلم کرنا، گالیاں دینا، غیبت کرنا، چغلی کرنا، گروہ بندی کرنا، لسانی، صوبائی یا کسی قسم کے تعصب میں مبتلا ہونا، حکام سے بغاوت کرنا، محلوں اور شہروں میں بدامنی پیدا کرنا، افواہیں پھیلانا، نامحرم مردوں اور عورتوں کا باہمی اختلاط، زنا، بدکاری، جوا، شراب، رشوت، سود اور ان جیسی تمام برائیوں اور بد اخلاقیوں سے سختی کے ساتھ روکا گیا کہ اس سے صالحیت تباہ و برباد ہو جاتی ہے، جب کہ کوئی مومن صالحیت کے بغیر مومنِ کامل نہیں ہو سکتا۔" (یاایھا الذین اٰمنوا: ۱/۲۸۷-۲۸۸)

قارئینِ کرام! یہ ہیں وہ حقائق جو صرف اور صرف مذہب اسلام کے پاکیزہ نظام، نظامِ صالحیت میں پائے جاتے ہیں۔

اگر آج بھی قوم مسلم ان اصول و قوانین پر کاربند ہو جائے اور اپنے شب و روز کو اسلامی اصول کے دائرہ میں گزارنا شروع کر دے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے ترقی کی منازل پر گام زن ہونے سے نہیں روک سکتی ہے۔ اس حیثیت سے اسلام کا یہ نظامِ صالحیت بھی انفرادی اور امتیازی خصوصیت کا حامل ہے۔

☆☆☆☆☆

پہلی قسط

فرزندانِ اشرفیہ کی علمی و تصنیفی خدمات

محمد فضل الرحمن برکاتی

جلالۃ العلم حافظ ملت حضرت علامہ شاہ عبد العزیز محدث مراد آبادی علیہ الرحمہ نے جس باغِ فردوس کو اپنے خونِ جگر سے سینچا تھا اس سے کھلنے والے گلہائے رنگارنگ روئے زمین پر اپنی بھینی بھینی خوشبوئیں بکھیر رہے ہیں، جن کا علمی فیضان ہر چہار جانب جاری و ساری ہے۔ آج اعلاے کلمۃ الحق کے جو کارہاے نمایاں آپ کے تلامذہ کے ذریعہ انجام پا رہے ہیں ان کی نظیر کم نظر آتی ہے۔ ہر میدان اور ہر شعبہ میں چاہے وہ تعلیم و تربیت اور ادب و صحافت کا شعبہ ہو، چاہے وہ تصنیف و تالیف اور دعوت و تبلیغ کا میدان ہو، چاہے وہ تحقیقی اور سیاسی میدان ہو، ان تمام شعبوں میں فرزندانِ اشرفیہ کی موجودگی اور عملی سرگرمیوں کی زبردست دھمک محسوس کی جا رہی ہے۔ آج کی تاریخ میں ان کا تعارف کرانے کے لیے ایک دفتر کی ضرورت ہے۔ سیکڑوں فرزندانِ اشرفیہ نے مختلف فنون پر کتابیں تصنیف کر کے اس سنسار میں اپنی خداداد علمی صلاحیت کا لوہا منوایا ہے۔ ان فرزندانِ اشرفیہ کی علمی اور تصنیفی خدمات کے حوالے سے ہم جس قدر معلومات رکھتے ہیں، ان کو آئندہ صفحات میں اختصار کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

① —شیخ القرا حضرت مولانا قاری محمد عثمان اعظمی علیہ الرحمہ (فراغت: ۱۹۳۵ء):- سرزمین گھوسی کو ایسے باکمال اصحابِ علم اور اربابِ فن کے مولد و مستقر بننے کا شرف حاصل ہے، جن کے علمی و تصنیفی کارنامے صدیوں تک یاد کیے جائیں گے اور ان کے قلمی شاہ کاروں سے دنیا فائدہ اٹھاتی رہے گی۔ انھیں علما میں ماضی قریب کے ایک عالم حضرت مولانا قاری الحاج محمد عثمان اعظمی علیہ الرحمہ بھی ہیں جنھوں نے اپنی بے لوث دینی خدمات اور گراں قدر تصنیفات کے ذریعہ نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔

آپ کی ولادت بمقام حسین پور گھوسی تقریباً ۱۹۱۸ء میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھوسی میں حاصل کی، پھر دار العلوم مئو میں داخلہ لیا اور ابتدائی عربی سے متوسطات تک کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد جامعہ سبحانیہ الٰہ آباد میں داخل ہو کر درسِ نظامی کی منتہی کتابیں پڑھیں اور تجوید و قراءت کی تکمیل کی۔ دورۂ حدیث کے لیے ۱۹۳۵ء میں دار العلوم اشرفیہ مبارک پور آئے اور اسی سال دار العلوم ہذا میں شعبۂ قراءت قائم ہوا تو اعزازی استاذ کی حیثیت سے تدریسی ذمہ داریاں بھی سنبھال لیں۔ فراغت کے بعد مستقل مدرس کی حیثیت سے آپ کا تقرر ہو گیا جہاں کئی سال تک فرائضِ منصبی انجام دیتے رہے۔ اشرفیہ سے علاحدگی کے بعد پانی پت، جلال پور، بنارس، رانچی، ممبئی، جمشید پور، کلکتہ، اترولہ، گھوسی، جودھپور، ناگپور، چھپرہ، کان پور اور نہ جانے کہاں کہاں یہ درویش خدا دینی و علمی خدمات انجام دیتا رہا۔ بالآخر ۱۱ر اگست ۱۹۹۵ء کو یہ ستارہ ہمیشہ کے لیے ڈوب گیا۔

(مقدمہ مصباح التجوید، ص:۲ - ناشر احمد ضیا قراءت اکیڈمی)

آپ ایک اچھے مدرس و مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب شاعر بھی تھے۔ ابتدا میں فائق تخلص رکھتے تھے بعد میں عثمان تخلص اختیار فرمایا۔ آپ کی تصنیفی و تالیفی خدمات درج ذیل ہیں:

① - مصباح التجوید، (فن تجوید میں طلبہ کے لیے مشعل راہ کتاب) ② - تفسیر سورۂ فاتحہ ③ - صبح سعادت ④ - تحقیق نیاز و فاتحہ ⑤ - عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم ⑥ - خیالِ حرم ⑦ - انکشافِ حقیقت (دو حصے) ⑧ - تنقیدی جائزہ ⑨ - شانِ بندگی ⑩ - پہلے کے سچے مسلمان ⑪ - آج کے جھوٹے مسلمان ⑫ - اسلامی تعلیم ⑬ - پالن حقانی پر ایک نظر ⑭ - سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم ⑮ - صداے فائق (مجموعۂ کلام) ⑯ - نغمۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم (نعتیہ مجموعہ)

② —سراج ملت حضرت مولانا شاہ سراج الہدیٰ گیاوی علیہ الرحمہ (فراغت: ۱۹۳۶ء):- آپ حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کے ارشد تلامذہ اور جامعہ اشرفیہ کے فارغین اولین میں سے ہیں۔ ۱۰ر و ۱۱ر ربیع الاول کی درمیانی شب چہار شنبہ ۱۳۳۲ھ کو آپ کی ولادت ہوئی۔ ابتدائی تعلیم حضرت مولانا محمد ولی حسن صاحب مونگیری سے حاصل کی، پھر حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمۃ والرضوان کی درس گاہ دار العلوم معینیہ عثمانیہ اجمیر شریف حاضر ہوئے وہاں حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ بھی زیر تعلیم تھے۔ جب حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمہ نے حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کو دار العلوم کا معین المدرسین مقرر فرما دیا تو زیادہ تر کتابیں حضرت حافظ ملت علیہ الرحمہ سے پڑھیں۔ حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمہ نے جب حضور حافظ ملت کو مبارک پور بھیجا تو آپ بھی انھیں کے ہم راہ مبارک پور چلے آئے اور یہیں سے درسِ نظامی کی تکمیل کی اور ۱۳۵۵ھ / ۱۹۳۶ء میں فراغت حاصل کی۔ آپ خانقاہ بیت الانوار گیا کے سجادہ نشیں اور ایک بلند پایہ خطیب تھے۔ جس موضوع پر گفتگو کرتے تھے اسے درجۂ کمال تک پہنچاتے تھے۔ اپنے خطاب میں عقائد باطلہ کی تردید کر کے اہل سنت و جماعت کی حقانیت کو اجاگر کرتے تھے۔ قوم و ملت کی رہ نمائی فرماتے ہوئے اسی سال کی عمر میں ۱۱ر مارچ ۱۹۹۲ء کو مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ آپ کی تصانیف کے نام درج ذیل ہیں۔

① - السراج الکامل ② - سراج ہدایت ③ - صداے حق ④ - السراج الوہاج۔ (ماخوذ از حیات مبین)

③ —حضرت مولانا سید شاہ عبد الحق گجھڑوی علیہ الرحمہ (فراغت: ۱۹۳۷ء):- مبارک پور سے متصل موضع گجھڑا میں شہنشاہ حضرت اورنگ زیب عالم گیر علیہ الرحمہ کے دورِ حکومت میں خانوادۂ غوثیہ کے چشم و چراغ سید السالکین حضرت مولانا سید شاہ کمال الدین رحمۃ اللہ علیہ نے بغداد سے آ کر سکونت اختیار کی جن کے صاحب زادے عہد عالم گیری میں پورے ہندوستان کے چیف جسٹس تھے۔ پیر طریقت حضرت مولانا سید عبد الحق علیہ الرحمہ اسی خانوادۂ مقدسہ کے چشم و چراغ کہے جاتے ہیں۔ آپ نے شروع سے آخر تک دار العلوم اشرفیہ میں تعلیم حاصل کی اور ہمیشہ ممتاز رہے۔ ۱۹۳۷ء میں جامعہ اشرفیہ سے فارغ التحصیل ہوئے، فراغت کے بعد مدھیہ پردیش کے علاقے میں دو سالہ تبلیغی خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد مدرسہ فیض العلوم دھوراجی (گجرات) میں اور رانچی میں درس و تدریس سے منسلک رہے، پھر اجمیر مقدس تشریف لے گئے اور تا حیات یہیں تبلیغ دین اور رشد و ہدایت کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ آپ علوم ظاہری و باطنی کے جامع تھے۔ آپ نے ہند و پاک، افغانستان، عرب، عراق، شام، اردن اور فلسطین وغیرہ کے سفر کیے اور وہاں کے اولیاے کرام کے مزارات پر عمر کا طویل حصہ گزارا اور دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ آپ کا وصال ۱۶ر اپریل ۱۹۸۸ء کو ہوا اور اجمیر مقدس کی سرزمین میں مدفون ہوئے۔ (حیات حافظ ملت)

آپ کی قلمی نگارشات کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

① - سلطان الاذکار (تذکرہ حضور غوث پاک رضی اللہ عنہ) ② - تذکرہ اللہ والوں کا ③ - چراغ راہ ④ - انوارِ مبین دو حصہ (بچیوں کی دینی و تعلیمی کتاب) ⑤ - نغمات سید، دو حصے (مجموعۂ کلام) ⑥ - مقالاتِ سید۔

④ —حضرت مولانا مفتی محمد محبوب اشرفی مصباحی (فراغت: ۱۹۳۹ء):- حضور حافظ ملت کی درس گاہ سے اولین دور میں اکتسابِ فیض کرنے والوں میں ایک مشہور نام مولانا محمد محبوب اشرفی کا بھی ہے۔ مبارک پور کے نواحی قریہ نوادہ میں اندازاً ۱۹۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم میں حاصل کر کے کچھ دن بریلی شریف اور کچھ دن میرٹھ میں تعلیم حاصل کی۔ درس نظامیہ کی تکمیل دار العلوم اشرفیہ سے کی اور یہیں بارگاہِ حافظِ ملت علیہ الرحمہ سے فتویٰ نویسی بھی سیکھی۔ مبارک پور میں دیوبندی مولویوں سے آویزش کے دور میں ایک کتاب "العذاب الشدید" (افاداتِ حضور حافظ ملت) لکھی جو عوام و خواص میں بہت مقبول ہوئی۔ (حیاتِ حافظ ملت)

⑤ —رئیس المتکلمین حضرت علامہ حافظ عبد الرؤف بلیاوی (حافظ جی علیہ الرحمہ (فراغت: ۱۹۴۲ء):- حضرت حافظ جی علیہ الرحمہ کو علوم و معارف میں کمال اور مہارت کی حیثیت سے دیکھا جائے تو وہ قوت میں علم کے جبل شامخ اور رفعت و بلندی میں آسمانِ علم کے بدرِ کامل تھے۔ آپ بہت سے علوم و فنون کی دولت سے مالا مال تھے۔ علم فقہ، علم کلام، علم منطق، علم فلسفہ، علم نجوم وغیرہ میں آپ کو یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ علم توقیت اور علم ریاضی میں بھی آپ کو بڑی مہارت حاصل تھی۔

ولادت و تعلیم:- صوبہ اتر پردیش کے ضلع بلیا کی تحصیل بانس ڈیہہ میں ایک قریہ بھوج پور ہے، وہیں ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ رسم بسم اللہ شریف کا مقدس فریضہ نانیہال میں ہی آپ کے ماموں حافظ محمد دین صاحب نے انجام دیا۔ تکمیل حفظ قرآن بھی

پرانی بستی، نزد جامع مسجد، مبارک پور، اعظم گڑھ

اپنے نانیہال کلکتہ میں کیا۔ ابتدائی عربی فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ذی قعدہ ۱۳۵۱ھ میں مدرسہ حنفیہ مراد آباد تشریف لائے اور متوسطات تک تعلیم حاصل کی، اس کے بعد دارالعلوم اشرفیہ کا رخ کیا اور یہاں کئی سال رہ کر اپنی علمی پیاس بجھاتے رہے۔ جب حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ اشرفیہ مبارک پور سے شوال ۱۳۶۱ھ مطابق ۱۹۴۲ء میں جامعہ عربیہ ناگ پور تشریف لے گئے تو اپنی علمی تشنگی بجھانے کے لیے حضرت مولانا ظفر علی صاحب قبلہ اور حضرت قاری مصلح الدین صاحب قبلہ کے ساتھ ناگ پور پہنچے۔ ان لوگوں کا تعلیم کا یہ آخری سال تھا، اس لیے یہیں مقدس علماے کرام کے مبارک ہاتھوں دستار بندی ہوئی، چوں کہ درسِ نظامی کی تکمیل دار العلوم اشرفیہ مبارک پور میں کی اس لیے جامعہ عربیہ ناگ پور کی سند نہیں لی۔

درس و تدریس:- حضرت حافظ جی علیہ الرحمہ فارغ ہونے کے بعد ۱۹۴۲ء میں جامعہ عربیہ ہی میں چند ماہ کے لیے عارضی طور پر مدرس ہو گئے۔ پھر مفتی اعظم ہند علیہ الرحمہ کے فرمان پر دار العلوم مظہر اسلام بریلی شریف میں تدریسی خدمات انجام دینے لگے اور ساتھ ہی ساتھ حضور مفتی اعظم ہند علیہ الرحمہ کے پاس افتا کا کام بھی کرتے۔ یہی مشق آگے چل کر فتاویٰ رضویہ جیسی عظیم علمی، فقہی تصنیف کی تحقیق و اشاعت کا اہم کام سر انجام دینے کی باعث بنی۔ ادھر پھر دار العلوم اشرفیہ مصباح العلوم مبارک پور میں حضور حافظ ملت کی تشریف آوری ہوئی اور اپنے دست و بازو کی حیثیت سے حضرت حافظ جی علیہ الرحمہ کا انتخاب فرمایا۔ اس کے لیے حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ بریلی شریف تشریف لے گئے اور حضور مفتی اعظم ہند علیہ الرحمہ سے منت سماجت کر کے حضرت حافظ جی علیہ الرحمہ کو مبارک پور لائے اور درس و تدریس کے لیے بہ حیثیت استاذ آپ کا تقرر کیا۔ کچھ دنوں بعد حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ نے آپ کو نائب شیخ الحدیث کے منصب پر فائز کیا اور اس منصب پر تاحیات قائم رہے۔ جب تک وہ باحیات رہے حضور حافظ ملت قدس سرہ نے طلبہ کی اصلاح و تربیت بلکہ اشرفیہ کا سارا نظم و نسق آپ کے سپرد کر دیا تھا۔

اہم کارنامے:- آپ کے کچھ اہم کارنامے ایسے ہیں جنھیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کے یہ کارنامے آبِ زریں سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔

① - تدریس و تعلیم کے ذریعہ بہترین مدرسین پیدا کرنا۔

② - الجامعۃ الاشرفیہ (عربی یونیورسٹی) کا خاکہ تیار کرنا۔

③ - سنی دار الاشاعت کا قیام اور فتاویٰ رضویہ کے قلمی نسخوں کی تحقیق و اشاعت۔

آپ نے سیدی اعلیٰ حضرت کے علمی خزینے "فتاویٰ رضویہ" کی اشاعت کے لیے ۱۳۷۹ھ / ۱۹۵۹ء میں "سنی دار الاشاعت" کی بنیاد رکھی۔ آپ اس کے بانی و روحِ رواں تھے۔ خود آپ ہی اس کے قیام کی وجہ یوں بیان فرماتے ہیں:

"جب ایک دفعہ شہزادۂ اعلیٰ حضرت حضور مفتی اعظم ہند مولانا مصطفیٰ رضا خاں صاحب علیہ الرحمہ دار العلوم اشرفیہ مبارک پور تشریف لائے، ان سے عرض کی گئی، فتاویٰ رضویہ کی اشاعت کا کوئی انتظام ہوا؟ آپ نے فرمایا تم لوگوں کے سوا کس سے اس کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اس کرامت آثار جملے نے دلوں میں ہمت اور عزائم میں استواری پیدا کی اور دار العلوم اشرفیہ کی رہ نمائی میں کام شروع ہوا اور سنی دار الاشاعت کی بنیاد رکھی گئی۔"

(مقدمہ فتاویٰ رضویہ، جلد سوم، ص:)

حضرت بحر العلوم مفتی عبد المنان صاحب قبلہ اعظمی دام ظلہ العالی لکھتے ہیں:

"مولانا عبد الرؤف صاحب علیہ الرحمہ سنی دار الاشاعت کی اسکیم بنانے والے تن تنہا تھے، اس کے بعد چندہ وصول کرنے میں وہی پیش پیش، بریلی شریف سے فتاویٰ کا مسودہ وہی لائے، مبیضہ انھوں نے کرایا، دونوں کا مقابلہ حرف بحرف انھوں نے ہی کیا، پریس والوں سے معاملہ انھیں کا کام تھا، کاپی، پروف، فہرست و عنوان کی تیاری، بار بار لکھنؤ جانا حتی کہ کتاب بھی خود ہی لانا اور یہاں طالب علموں کے ساتھ مل کر بنڈل ڈھونا کس کس بات کو یاد کیا جائے، کتاب چھپ گئی تو لوگوں کو خطوط لکھنا، آرڈر بک کرنا، ان کے لیے پارسل سینا، اس کو بھیجنا، کون سا کام تھا جو تنہا مولانا نے نہ کیا ہو اور اس خاموشی اور بے نیازی سے کہ نہ صلے کی خواہش نہ داد کی پروا۔ مرنے والے کی ایک ایک ادا یاد آ کے خون کے آنسو رلاتی ہے اور کیوں نہ ہو

جان کر منجملۂ خاصانِ مے خانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

(فتاویٰ رضویہ، ج: پنجم، عرض حال، ص: ۱)

فتاویٰ رضویہ شریف کی تحقیق و تنقیح میں آپ نے خون پسینہ ایک کر دیا تھا، کبھی کبھی ایک عبارت کی تحقیق میں آپ رات رات بھر جاگ جایا کرتے تھے، یہاں تک کہ فجر کی اذان ہو جایا کرتی تھی۔

"فتاویٰ رضویہ کے بعض اوراق کو کیڑوں نے بری طرح چاٹ لیا تھا، ان میں جہاں جہاں کتاب کی عبارت اور تصحیح ممکن تھی کر دی گئی، جہاں سے ماسبق اور مالحق سے عبارت بن سکتی تھی بنا دی گئی اور جہاں مجبوری تھی بیاض چھوڑ دی گئی۔"

(فتاویٰ رضویہ، ج: سوم، ابتدائیہ حضرت حافظ جی علیہ الرحمہ، ص: ۳)

درج بالا عبارتوں سے حضرت حافظ جی علیہ الرحمہ کی وسعتِ علمی، فقہی مہارت اور علمی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ فتاویٰ رضویہ سے متعلق آپ کی ناقابلِ فراموش محنت کا بھی پتہ چلتا ہے۔

حضرت حافظ جی علیہ الرحمہ نے اپنی محنت و مشقت سے اپنی حیات ہی میں فتاویٰ رضویہ جلد سوم و چہارم کی اشاعت کر ڈالی اور جلد پنجم پریس کے حوالے کر کے اللہ کو پیارے ہو گئے۔

اگر حضرت حافظ جی علیہ الرحمہ چاہتے تو بہت سی تحقیقی کتابیں تصنیف فرما دیتے مگر فتاویٰ رضویہ شریف کی تحقیق و اشاعت کو آپ نے مقدم سمجھا۔ آپ نے تصنیف و تالیف کا کوئی کام نہیں کیا کیوں کہ درس گاہ میں رہ کر تدریس و تعلیم میں خوب سے خوب تر کی طرف مسلسل اور غایت درجہ انہماک نے آپ کو فرصت ہی نہ دی...... تاہم اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کے علمی خزینے "فتاویٰ رضویہ" کو کرم خانے سے نکال کر کتب خانے کی نذر کرنے کا کارنامہ اتنا عظیم ہے جو ہزارہا تصنیف و تالیف پر بھاری ہے۔

(تذکرہ حافظ عبد الرؤف علیہ الرحمہ، از: مولانا قمر الحسن بستوی، ص: ۵۳)

۱۴ر شوال المکرم ۱۳۹۱ھ مطابق ۱۹۷۱ء بروز جمعہ علم کا یہ سورج ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔

(مضمون کے بیش تر مندرجات "تذکرہ حافظ عبد الرؤف علیہ الرحمہ" سے ماخوذ ہیں)

❻ - شارح بخاری فقیہ اعظم ہند مفتی محمد شریف الحق امجدی علیہ الرحمہ (فراغت: ۱۹۴۲ء):

نائب مفتی اعظم ہند حضرت مفتی محمد شریف الحق امجدی علیہ الرحمہ قصبہ گھوسی ضلع مئو کے ایک دین دار گھرانے میں ۱۱ر شعبان ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۰ر اپریل ۱۹۲۱ء کو پیدا ہوئے۔ مقامی کتب خانے میں ناظرہ و قرآن شریف کی تعلیم حاصل کی۔ علم دین کے حصول کی غرض سے ۱۰ر شوال المکرم ۱۳۵۳ھ / ۱۹۳۴ء کو دار العلوم اشرفیہ مصباح العلوم میں حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمہ کے ہمراہ تشریف لائے اور آٹھ سال تک درسِ نظامی کی مسلسل تعلیم حاصل کرتے رہے۔ کسی سبب سے ۷/۸ ماہ مدرسہ عربیہ اندر کوٹ میرٹھ میں علم کی تشنگی بجھائی، پھر ۱۹۴۲ء میں دار العلوم مظہر اسلام بریلی شریف میں داخلہ لے کر دورۂ حدیث کی تکمیل کی اور یہیں سے سند فراغت حاصل کی۔

فراغت کے بعد مدرسہ بحر العلوم مئو سے اپنے تدریسی سفر کا آغاز کیا اور ملک کی مختلف درس گاہوں میں ۳۳ر سال تک اپنا علمی فیضان لٹاتے رہے۔ ۱۳ر دسمبر ۱۹۷۶ء کو بہ حیثیت صدر شعبۂ افتا جامعہ اشرفیہ تشریف لائے اور تاعمر اس منصب کو زینت بخشی، آپ کے مندرجہ ذیل کارنامے آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔

① - ۲۰ر شوال المکرم ۱۳۷۸ھ مطابق ۲۹ر اپریل ۱۹۵۹ء میں فتویٰ نویسی کا آغاز کیا اور تاعمر یہ سلسلہ جاری رہا۔ آپ نے تقریباً ۴۰ ہزار فتاویٰ تحریر فرما کر مختلف اوقات میں ملت کی رہ نمائی فرمائی جو ایک ناقابلِ فراموش کارنامہ ہے۔

② - آپ نے مختلف مناظروں میں اہل سنت و جماعت کی نمائندگی کی اور وہابیہ دیوبندیہ کو شکست فاش دی اور اہل سنت کا سر فخر سے اونچا کیا۔

تصانیف:- آپ محدث، مفسر، شارح، مناظر، فقیہ، مدرس، مصنف، محقق، مقرر، ناقد، مفتی جیسے بہت سے اوصاف اور خوبیوں کے مالک تھے۔ آپ جامعہ اشرفیہ میں صدر شعبۂ افتا، ناظم تعلیمات اور سرپرست مجلس شرعی کے عظیم منصب پر فائز تھے۔ شارحِ بخاری علیہ الرحمہ کی کتابوں کی فہرست ملاحظہ فرمائیں۔

① - اشرف السیر ② - اسلام اور چاند کا سفر ③ - سنی دیوبندی اختلافات کا منصفانہ جائزہ ④ - فتنوں کی سرزمین کون نجد یا عراق ⑤ - مقالاتِ شارحِ بخاری (تین جلد) ⑥ - تحقیقات (دو حصے) ⑦ - مقالاتِ امجدی ⑧ - مسئلۂ تکفیر اور امام احمد رضا ⑨ - اثباتِ ایصالِ ثواب ⑩ - حواشی فتاویٰ امجدیہ ⑪ - مفتی اعظم اپنے فضل و کمال کے آئینے میں ⑫ - اذانِ خطبہ (افادات) ⑬ - تنقید برمحل (افادات) ⑭ - حواشی روداد مناظرہ ⑮ - السراج الکامل ⑯ - نزہۃ القاری شرح صحیح البخاری (۹ر جلدیں) ⑰ - فتاویٰ شریفیہ (غیر مطبوعہ) .... **(جاری)**

غلام غوث قادری

پہاڑوں کا سلسلہ دور دور تک پھیلا ہوا ہے، زیادہ تر پہاڑ برفیلے ہیں اور کچھ پتھریلے بھی جو گھنے اور خوف ناک ہیں۔ یہ پہاڑ «نیپال» کے قلعے ہیں، جن کی وجہ سے چینی فوج اس ملک پر حملہ کرنے کی کوشش نہیں کرتی ہے۔

نیپال چاروں طرف سے خشکی سے گھرا ہوا ہے۔ اس کے مشرق، مغرب اور جنوب میں «ہند» ہے، جب کہ شمال میں «چین» واقع ہے۔ جغرافیائی گھیراؤ کے ساتھ ساتھ عملی طور پر بھی بھارتی اثر و رسوخ بہت زیادہ ہے۔

مشرقی سرحد میچی ندی سے لے کر مغربی سرحد مہاکالی ندی تک اس کی لمبائی ۸۸۵؍ کلومیٹر ہے، شمال و جنوب میں اس کی چوڑائی ایک جیسی نہیں ہے۔ کہیں زیادہ ہے تو کہیں کم۔ مغرب میں اس کی سب سے زیادہ چوڑائی ۲۴۰؍ کلومیٹر اور مشرق کی طرف سب سے کم ۱۲۸؍ کلومیٹر ہے۔ نیپال کا کل رقبہ ایک لاکھ سینتالیس ہزار ایک سو اکیاسی (۱۴۷۱۸۱) مربع کلومیٹر ہے۔

ہمالیائی ملک نیپال کا وجود بحیثیت نیپال بکرمی ۱۸۲۵/ ۱۷۶۸ء میں ہوا۔ اٹھارہویں صدی عیسوی سے قبل نیپال تین مختلف حصوں میں بٹا ہوا تھا:

(۱) گورکھا (۲) پاٹن (۳) کاٹھ مانڈ

یہ تین الگ الگ ریاستیں تھیں، جن کی اپنی حکومت، اپنی فوج، اپنا سکہ اور اپنے قوانین تھے۔ ۱۸۱۴ بکرمی/ ۱۷۵۷ء میں گورکھا کا بادشاہ «پرتھوی نارائن شاہ» پاٹن اور کاٹھ منڈو پر حملہ آور ہوا اور مسلسل گیارہ سال کی خوں ریزی کے بعد ۱۸۲۵ بکرمی/ ۱۷۶۸ء میں ان پر قابض ہوا۔ اس طرح پرتھوی نارائن شاہ نے اسے الگ اور مستقل ملک کی حیثیت دے دی، اس کا نام نیپال رکھا اور خود کو وہاں کا بادشاہ قرار دیا۔

نیپال کی وجہِ تسمیہ:

نیپال کا نام «نیپال» کیسے پڑا؟ اس سلسلے میں مختلف آرا ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہاں «نے» نام کا ایک مُنی [سادھو] آباد ہوا جس نے «گوپال» نسل کے ایک شخص کو یہاں کا راجہ بنایا۔ اسی «نے» مُنی اور بادشاہ «گوپال» کے نام سے اس وادی کا نام «نیپال» [نےِ پال] پڑا۔ لیکن کچھ لوگ اس سے اختلاف رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ «نے» کا مطلب «گھر» اور «پال» کا معنی «اون» ہے اور چوں کہ کاٹھ منڈو وادی میں اون کی پیداوار زیادہ ہے اسی مناسبت سے اسے «اون کا گھر» یعنی «نیپال» کہتے ہیں اور یہی ذہن سے زیادہ قریب ہے۔

نیپال کو انتظامی طور پر ۱۴؍ انچل (زونز) اور ۷۵؍ اضلاع میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کا دارالحکومت کاٹھ مانڈو ہے۔ چوں کہ دنیا کی بلند ترین پہاڑی چوٹی «ماؤنٹ ایوریسٹ» یہیں یعنی اس کے شمال میں واقع ہے، اس لیے کاٹھ مانڈو سیاسی، تجارتی، صنعتی اور ثقافتی مرکز ہونے کے علاوہ سیاحت کے لیے بھی مشہور ہے۔

قدرتی اعتبار سے نیپال دو حصوں میں منقسم ہے۔[۱] پہاڑی علاقہ [۲] ترائی علاقہ —— ملک کا زیادہ حصہ پہاڑی علاقہ میں پڑتا ہے۔ پہاڑی علاقہ کے شمال والے حصے کو ہمالیائی علاقہ کہتے ہیں۔ یہ علاقہ برفیلے پہاڑ کی اونچی اونچی چوٹیوں سے مل کر بنا ہے۔ دنیا کی سب سے اونچی چوٹی ماؤنٹ ایوریسٹ جسے نیپالی زبان میں «سگرماتھا» کہا جاتا ہے، اسی علاقے میں واقع ہے۔ جب کہ نیپال کی راجدھانی کاٹھ مانڈو جنوبی حصہ میں واقع ہے۔

ہندوستانی سرحد سے متصل میدانی حصے کو جو پہاڑی علاقے

کے جنوب میں واقع ہے، ترائی علاقہ کہا جاتا ہے، اس علاقے میں آریائی نسل کے لوگ آباد ہیں، ان کی آبادی بہت گھنی ہے۔

نیپالی باشندوں کو ثقافتی، لسانی اور تہذیبی طور پر دو بڑے گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک ہندوستانی نیپالی [آریائی نسل کے لوگ] ہیں جن کے آبا و اجداد جنوب سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہوئے، جب کہ دوسرا گروہ تبتی نیپالیوں [منگولین نسل] کا ہے جو شمال سے آئے تھے۔ صدیوں پہلے یہاں آ کر آباد ہونے والے دونوں گروہوں نے ابھی تک نہ صرف یہ کہ اپنی ثقافتی و لسانی پہچان برقرار رکھی ہوئی ہے، بلکہ دونوں گروہوں کے جسمانی خد و خال اور نقوش بھی انھیں ایک دوسرے سے ممتاز کرتے ہیں۔ نیپال میں تقریباً ایک سو زبانیں بولی جاتی ہیں، جن میں نیپالی، انگلش، اردو اور ہندی کثیر الاستعمال ہیں۔ سرکاری زبان نیپالی ہے۔ یہاں کی مسلمان آبادی دس فی صد ہے۔

اگر ہم نیپال کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو اسے تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔[۱] قدیم نیپال [۲] عہدِ وسطیٰ کا نیپال [۳] جدید نیپال۔

قدیم نیپال:

قیامِ نیپال سے لے کر ۱۸۲۵ بکرمی/ ۱۷۶۸ء تک کے عرصے کو قدیم نیپال کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اس عہد میں نیپال تین ریاستوں گورکھا، پاٹن اور کاٹھ مانڈو میں بٹا ہوا تھا۔ ہر ریاست کے انتظام الگ تھے۔ ۱۸۲۵ بکرمی/ ۱۷۶۸ء میں پرتھوی نارائن شاہ نے تینوں ریاستوں کو زیر نگیں کر کے متحد کیا۔

قرونِ وسطیٰ کا نیپال:

۱۸۲۵ بکرمی/ ۱۷۶۸ء سے ۲۰۶۵ بکرمی/ ۲۰۰۸ء تک کے عرصے کو «قرونِ وسطیٰ» کا نام دیا جاتا ہے۔ اس عہد میں آمریت اور مطلق العنانی کا دور دورہ تھا۔ بادشاہ کا حکم پتھر کی لکیر ہوتا تھا، اگرچہ اس عہد کے آخر میں بادشاہوں کا اختیار کم ہو گیا تھا لیکن پھر بھی جمہوریت نہیں تھی۔

جدید نیپال:

۲۰۶۵ بکرمی/ ۲۰۰۸ء سے جدید نیپال کی شروعات ہوتی ہے۔ ۱۵؍ جیٹھ ۲۰۶۵ بکرمی/ ۲۸ مئی ۲۰۰۸ء کو ۲۴۰؍ سالہ بادشاہت کا خاتمہ ہوا اور نیپال «ہندو راشٹر» سے ایک سیکولر ملک قرار پایا۔ اس کے بعد نیپال کی تاریخ میں ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔

نیپال میں مسلمانوں کی آمد:

نیپال میں مختلف مذاہب کے باشندے آباد ہیں، جن میں مسلمان بھی ہیں، لیکن کب سے ہیں، یہ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔ یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ابتدائے اسلام سے ہی نیپال کا رابطہ مسلمانوں سے رہا ہے، جیسا کہ «حُدُود العالَم» جو ۹۸۳ء میں شائع ہوئی، میں مذکور ہے کہ «نیپالی مشک عرب میں برآمد کیا جاتا تھا۔» البتہ کچھ قرائن سے مسلمانوں کی آمد کا پتہ چلتا ہے۔

ترائی علاقہ میں مسلمانوں کی آمد:

۱۳۸۱ بکرمی/ ۱۳۲۴ء کو نیپال میں مسلمانوں کی آمد کا پہلا واقعہ مانا جا سکتا ہے، جب دلی کے بادشاہ غیاث الدین تغلق نے ترائی علاقے کی ایک خود مختار ریاست «ترہُٹ» کی راجدھانی «سِمرون گڑھ» پر حملہ کیا تھا، لیکن بعد میں سلطان غیاث الدین واپس چلا گیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مسلمانوں کی آمد عارضی تھی۔ اس کے بعد ۱۹۱۴ بکرمی/ ۱۸۵۷ء میں جب انگریزوں کے خلاف ہندوستان میں آزادی کی لڑائی چل رہی تھی تو نیپال نے فوج بھیج کر انگریزوں کی مدد کی تھی، جس سے وہ خوش ہو کر نیپال کا وہ حصہ جو نیپال نے «سُوگولی معاہدہ» میں کھو دیا تھا، واپس کر دیا۔ اسی حصے کا نام «نیا ملک» پڑا۔ لیکن ان حصوں میں مسلمان پہلے ہی سے آباد تھے۔ اس لیے جب یہ حصہ واپس ہوا تو یہاں کے مسلمان بھی چلے آئے۔ البتہ ہجرت کر کے نیپال میں مستقل رہائش کے لیے مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ انیسویں صدی عیسوی کے ابتدائی زمانے سے اس وقت شروع ہوا جب نیپالی حکمرانوں نے ہندی عوام کو یہاں زراعت کی اجازت دی اور ان کی کارگزاری پر ان کی حوصلہ افزائی بھی کی۔ اس کے بعد ہی سے سرحدی علاقے کے ہندی مسلمان نیپال میں مستقل طور پر رہائش پذیر ہوئے۔

پہاڑی علاقوں میں مسلمانوں کی آمد:

پہاڑی علاقوں کے دو حصے ہیں [۱] کاٹھ مانڈو [۲] دیگر پہاڑی علاقے۔

کاٹھ مانڈو میں مسلمانوں کی آمد:

کاٹھ مانڈو میں مسلمانوں کی آمد و رفت ۱۴۰۶ بکرمی/ ۱۳۴۹ء کے قبل ہی سے تھی جو کشمیر کے رہنے والے تھے اور تجارتی سفر سے تبت جایا کرتے تھے تو درمیان میں کچھ دن کاٹھ مانڈو میں

بھی قیام کرتے اور تجارت بھی کیا کرتے تھے، لیکن نیپالی «راجہ رتن مل» نے جب اپنے دورِ اقتدار میں مسلمانوں کا کاٹھ مانڈو میں مستقل طور پر رہائش کی اجازت دی تو اسی وقت سے کشمیری اور تبتی مسلمان یہاں رہنے لگے۔ انھیں مسلمانوں میں ایک کشمیری بزرگ ۱۵۹۱ بکرمی/ ۱۵۳۴ء میں کاٹھ مانڈو آئے اور وہاں ایک مسجد تعمیر کی جو آج «جامع مسجد کشمیری تکیہ» کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا واقعہ یہ ہے کہ «راجہ رتن مل» کے دور میں ایک کشمیری بزرگ [جن کا نام معلوم نہ ہو سکا البتہ وہ کشمیری شاہ بابا کے نام سے مشہور ہیں اور نزد مسجد ان کا مزار بھی ہے۔ ہماری کاہلی کی وجہ سے مسجد کے علاوہ بقیہ زمین پر آج وہابیوں کا قبضہ ہے، افسوس!] اپنے گدھے پر سوار ہو کر کشمیر سے کاٹھ مانڈو تشریف لائے۔ بادشاہ کی بیوی اپنی سہیلیوں اور شاہی فوج کے ساتھ سیر و تفریح کے لیے جا رہی تھی، اچانک رانی ہاتھی کے ساتھ غائب ہو گئی۔ جب بادشاہ کو یہ بات معلوم ہوئی تو اس نے اپنی فوج کو رانی کی تلاش میں بھیجا اور انعام بھی رکھا۔ لیکن تلاشِ بسیار کے باوجود بھی رانی نہ ملی تو کسی نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ کشمیری شاہ بابا کے پاس جائیں شاید وہ بتا دیں۔ بادشاہ ان کے پاس گیا اور ان سے اپنی بات پیش کی تو بابا نے بتایا کہ اس پتے کو اٹھاؤ اس کے نیچے تمہاری رانی ہے [بعض لوگ یہ بتاتے ہیں کہ بزرگ نے کہا کہ تمہاری رانی فلاں جنگل میں ہے] بادشاہ نے بزرگ کے حکم کی تعمیل کی تو سچ مچ اس کی رانی سفید ہاتھی کے ساتھ موجود تھی۔ بادشاہ اپنی رانی کو پاکر بہت خوش ہوا اور عرض کیا کہ آپ جو مانگیں میں دوں گا۔ بزرگ نے کہا: میرا یہ گدھا جتنی دور میں گھومے گا وہ زمین مجھے دے دو۔ گدھا ایک کیل سے بندھا تھا۔ بادشاہ نے سوچا یہ گدھا تھوڑی دور گھومے گا، اس لیے بزرگ کے اس مطالبہ کو تسلیم کر لیا۔ جب بزرگ نے اپنے گدھے کو اٹھایا تو وہ کئی ایکڑ زمین میں گھوم کر واپس اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ [بعض لوگ بتاتے ہیں کہ آپ نے بادشاہ سے یہ کہا کہ میں اپنی جوتی پھینک رہا ہوں، جہاں تک جائے گی وہ زمین مجھے دے دو، پھر آپ نے اپنی جوتی پھینکی تو وہ کئی ایکڑ زمین دور جا کر گری] بادشاہ نے انھیں اتنی زمین دے دی اور کہا کہ آج سے اس زمین کے مالک آپ ہیں، آپ جو چاہیں کریں۔ کشمیری بزرگ نے وہاں مسجد کی تعمیر کی، جس کو تاریخی اعتبار سے نیپال کی سب سے پہلی مسجد قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس وقت کافی مسلمان کاٹھ مانڈو میں رہتے تھے تبھی تو بزرگ نے مسجد کی تعمیر کی۔

اس کے بعد ۱۸۲۵ بکرمی/ ۱۷۶۸ء میں گورکھا کے بادشاہ «پرتھوی نارائن» نے کاٹھ مانڈو پر قبضہ کے وقت مسلمانوں کو بارودی اسلحہ بنانے کے لیے بلایا تھا۔ بعد میں یہ مسلمان بھی کاٹھ مانڈو میں آباد ہو گئے۔

دیگر پہاڑی علاقوں میں مسلمانوں کی آمد:

کاٹھ مانڈو کے علاوہ دیگر پہاڑی علاقوں میں مسلمان مختلف مدتوں میں آباد ہوتے رہے۔ چناں چہ سولھویں، سترہویں اور اٹھارہویں صدی عیسوی میں مسلمان گورکھا، نواکوٹ، تنہو اور گنڈکی کے علاقے میں آباد ہوئے جنھیں وہاں کی خود مختار ریاستوں کے حکمرانوں نے بارودی اسلحہ بنانے اور اپنی فوج کو چلانے کی تربیت کے لیے بلایا تھا۔

اخیر میں ۱۹۱۴ بکرمی/ ۱۸۵۷ء میں ہند میں جنگ آزادی کے بعد جب انگریزوں نے مسلمانوں کے خلاف ایذا رسانی کو تیز کر دیا تو مسلمان ان کے مظالم سے تنگ آکر ہند سے نیپال کے مختلف پہاڑی علاقوں کی طرف ہجرت کر گئے، اور آج مسلمان پورے نیپال میں آباد ہیں، جیسا کہ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۲۰۴۸ بکرمی/ ۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے مطابق نیپال کے ۷۵/ اضلاع میں سے ۷۴/ اضلاع میں مسلمان آباد تھے۔ صرف «منانگ» ایسا ضلع ہے جہاں ایک بھی مسلمان آباد نہیں تھا۔ لیکن اب یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہاں بھی مسلمان آباد ہو گئے ہوں گے۔

پورے نیپال میں مسلمان آباد ہیں، مگر ان میں کس حد تک اسلامی تہذیب پائی جاتی ہے اور اسلامی تعلیمات سے وہ کس قدر آشنا ہیں، جب اس بارے میں سوچتے ہیں تو آپسی اختلاف، ذہنی عیاشی کاہلی، کوتاہی اور کردار کی خرابی پر رونا آتا ہے۔

مسلمانوں کی مذہبی حالت:

مسلمانوں کی دینی حالت دن بہ دن خراب ہوتی جا رہی ہے۔ وہ اسلامی تہذیب و ثقافت سے دور ہوتے جا رہے ہیں، تہذیبِ اغیار کو اپنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں، اسلامی تعلیمات اور اسلاف کے اقدار و روایات کو بھولتے جا رہے ہیں۔ مرد و زن کا باہم اختلاط اور ان کی بے تکلفی بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ غیر مسلموں کی طرح مسلمان بھی ڈانس کلب کھول کر نئی نسل کو رقص و سرود کا دیوانہ

بناتے ہیں، عورتیں مغربی طرز کے لباس پہن کر دعوتِ گناہ دیتی ہیں اور بری نظروں کا شکار ہونے میں خوشی محسوس کرتی ہیں۔ شادی بیاہ کے موقع پر اغیار کی طرح مسلموں میں بھی بینڈ باجا دھیرے دھیرے رواج پا رہا ہے۔ جہیز لینا ضروری امر سمجھا جاتا ہے، گویا اس کے بغیر شادی ہوتی ہی نہیں۔ نوجوان نشہ آور چیزوں کے عادی بنتے جا رہے ہیں۔ بعض گھرانے ایسے بھی ہیں جہاں سال میں صرف ایک ہی مرتبہ قرآن پاک شعبان کے موقع پر پڑھا جاتا ہے۔ الغرض مسلمانوں کی مذہبی حالت ناگفتہ بہ ہے، اسلامی تعلیمات حاصل کرنے کا رجحان بہت حد تک کم ہو گیا ہے۔ لیکن پھر بھی ان کے اندر یک گونہ دینی جذبہ ہے جسے پروان چڑھانے کی ضرورت ہے۔

مسلمانوں میں تعلیمی پس ماندگی:

نیپال میں کل چالیس ہزار اسکول ہیں۔ نیپال کے اکثر مسلمان دینی تعلیم سے دور ہیں، دنیاوی تعلیم میں بھی ہمارا گراف خوش گوار نہیں ہے۔ ہند سے متصل سرحدی علاقوں کے مسلمان ہند آکر دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں، لیکن ان کی تعداد بھی زیادہ نہیں۔ جب کہ پہاڑی علاقوں کے مسلمان ضروریاتِ دین سے بھی ناواقف ہیں۔ مسلمان گھرانے میں پیدا ہونے کی وجہ سے وہ مسلمان رہتے ہیں، وہ اتنے بھولے ہوتے ہیں کہ جو شخص بھی کرتا پاجامہ اور ٹوپی لگا کر جاتا ہے، اسے عالم سمجھ کر نماز پڑھانے کے لیے بڑھا دیتے ہیں۔ اسلامی تعلیمات سے دوری کا دیگر فرقِ باطلہ خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وہ لوگ دیہاتوں اور پہاڑی علاقوں میں جا کر اپنے عقائد فاسدہ بتاتے ہیں، ان کی مالی امداد بھی کرتے ہیں اور اپنے ہم مذہب مولوی کو رکھ کر اپنے عقائد کی تشہیر اور اہل سنت و جماعت کے خلاف برگشتہ کرتے ہیں۔ ان تک نیپالی زبان میں لکھی ہوئی کتابیں پہنچاتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف ہمارے سنی علما اپنی ذاتی مصروفیات یا کسی دوسری وجہ سے پہاڑی علاقوں میں جا کر لوگوں کو اسلامی باتیں نہیں بتاتے ہیں، بلکہ خود اپنے مدارس سے تعلیمی پس ماندگی کو ختم کر کے معیارِ تعلیم بلند نہیں کر پاتے ہیں۔ جب لوگ اسلامی تعلیمات سے ہی دور ہوں گے تو وہ اسلامی تہذیب میں کس طرح رنگے ہوں گے، اس کا اندازہ بالکل ظاہر ہے۔

صحافت سے دوری:

کسی زمانے میں قلم کی فضیلت بیان کرنے کے لیے «قلم کی تلوار» اور «تلوار یا قلم» جیسی تراکیب استعمال کی جاتی تھیں۔ اور اب یہ فضیلت حقیقت بن چکی ہے، اسی لیے ہر قوم اخبار و رسائل کی اشاعت کرتی ہے، لیکن اس سے بھی ترقی کر کے کمپیوٹر کی طرف بھاگ رہی ہے۔ لیکن پورے نیپال میں اہل سنت و جماعت کی طرف سے اس وقت کوئی اخبار شائع نہیں ہو رہا ہے۔ اس کے برعکس وہابی ازم، نیپال کے مختلف علاقوں سے اردو اور نیپالی زبان میں رسالے شائع کرتے ہیں۔ جنک پور سے ایک ہفت روزہ اخبار «صدائے عام» بھی شائع ہو رہا ہے۔ انھوں نے اعزازی ممبر سنی مال داروں کو بنایا ہے۔ زیادہ تر ایڈورٹائز [اشتہار] بھی سنی حضرات ہی دیتے ہیں۔ غرض کہ ان کی مالی اور دوسری طرح کی امداد بھی اہل سنت و جماعت کی طرف سے ہوتی ہے، لیکن ہمارے سنی علما و دانش وران اس طرف توجہ دینے ہی کو فضول سمجھتے ہیں، اسی لیے اس کے بارے میں کچھ بھی کوشش نہیں کرتے۔ اگر توجہ دلائی بھی جاتی ہے تو مالی کمی کی شکایت کرتے ہیں، آخر کیا وجہ ہے کہ وہی مال دار وہابی ازم کی مدد کرتے ہیں اور ہماری نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسلم دانش وران منفی سوچ کے عادی ہوتے جا رہے ہیں جو کہ ترقی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

میڈیا سے بے اعتنائی:

نیپال میں ۹/ ٹی. وی. چینلز اور ڈیڑھ دو سو ایف. ایم. ریڈیو اسٹیشنز ہیں۔ ٹی وی چینل پر آنے کا مسئلہ ابھی مختلف فیہ ہے، اس لیے مسلم علمائے کرام دین اسلام کی تبلیغ کے لیے ٹی وی چینل پر آنے سے گریز کر رہے ہیں۔ البتہ ایف. ایم. والے ہر مذہبی تقریب کے موقع پر بڑے بڑے دانش وروں کے انٹرویو نشر کرتے ہیں۔ اسلامی تقریبات کے موقع پر بھی وہ لوگ بڑے بڑے علما کے انٹرویو نشر کرتے ہیں۔

تین چار سال قبل سنی مولانا ہفتہ یا مہینے میں بیان دیتے تھے، مگر اس کے بعد ہماری طرف سے جو خاموشی چھائی ہے اس کا سلسلہ ابھی تک برقرار ہے۔ ہمارے حریف پہلے پہل تو ہمارے ہی بول بولتے تھے مگر ڈیڑھ دو سال سے انھوں نے اپنا اصلی رنگ دکھانا شروع کر دیا ہے۔ گزشتہ رمضان میں ایک دن میں نے ایک ایف. ایم. اسٹیشن چالو کیا تو ایک مولانا رمضان اور تراویح کے بارے میں بتا رہے تھے۔ دورانِ بیان انھوں نے کہا «تراویح میں ۸/ رکعت ہی مسنون ہے آج کل بعض حضرات جو بیس رکعت

پڑھتے ہیں وہ سنت کے خلاف عمل کرتے ہیں، ۲۰ رکعت تراویح پڑھنا بدعت ہے۔»

دوسرے دن کسی اسٹیشن پر پھر تقریر نشر ہو رہی تھی، درمیان میں کسی کے سوال «کیا کوئی بندہ غریب نواز ہو سکتا ہے؟» کا جواب دیا گیا کہ «بندہ نواز اور غریب نواز ہونا صرف خدا کی صفت ہے کوئی بندہ، غریب نواز نہیں ہو سکتا، جو ایسا مانے وہ مشرک ہے۔» اسی طرح ہر جمعہ میں وہ اپنے عقائد کی تشہیر کرتے ہیں۔

سیاست سے دوری:

آج تبلیغ دین میں جس طرح صحافت کا بڑا دخل ہے، اسی طرح سیاست بھی بڑی موثر ہے۔ علاوہ ازیں ہر قوم اپنی بہتری کے لیے اپنا نمائندہ چن کر پارلیمنٹ میں بھیجتی ہے تاکہ ان کی بات میں وزن ہو، انھیں جائز حقوق و مراعات حاصل ہوں، تمام اقوام کے نمائندے پارلیمنٹ کے ممبر ہیں۔ بدقسمتی سے اگر اس میدان میں کوئی قوم پیچھے ہے تو وہ قوم مسلم ہے۔ اس وقت نیپالی پارلیمنٹ ۶۰۰؍ اراکین پر مشتمل ہے۔ جن میں سے ۱۸۰؍ خواتین اور ۱۶؍ مسلم ممبران ہیں۔ اس میدان میں جو بھی مسلم ممبران ہیں وہ قومی مفاد پر اپنے مفاد کو ترجیح دیتے ہیں کیوں کہ وہ یا تو جاہل ہیں یا صرف دنیاوی علوم سے آشنا۔ ان کے اندر نہ تو دینی جذبہ ہے اور نہ ہی غیرتِ ایمانی۔ علما اس کی اہمیت سمجھتے ہوئے بھی اس میں حصہ داری کو غیر ضروری سمجھتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہم اقتدار سے بے دخل ہو چکے ہیں۔

معاشی حالت:

مسلمانوں نے مختلف ذریعۂ معاش کو اپنایا ہے۔ اس میدان میں پہلے سے بہتری آئی ہے، لیکن اب بھی غریبوں کی تعداد زیادہ ہے، علاقے کے اختلاف سے ان کے ذرائع معاش بھی مختلف ہیں، ترائی علاقہ [ہند سے متصل علاقہ] کے دیہاتوں کے مسلمان ہر اعتبار سے پچھڑے ہوئے ہیں۔ دینی تعلیم وہ بہ مشکل ہی حاصل کر پاتے ہیں اور دنیاوی تعلیم کا معیار بھی بلند نہیں۔ تعلیم سے دوری ہی کی وجہ سے ان کا کل ذریعۂ معاش مکئی وغیرہ کی کھیتی اور جانوروں کی پرورش ہے۔

شہر کے مسلمانوں نے مختلف میدانوں میں اپنا ذریعۂ معاش تلاش کر لیا ہے، ادھر چند سالوں سے عرب جانے کا رجحان بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ ان کی معاشی حالت مضبوط ہوئی اور ساتھ ہی اپنے بچوں کو بڑے بڑے اسکولوں میں داخل کرانے کا خواب پورا ہونے لگا ہے، لیکن ایک خرابی یہ آئی ہے کہ کوئی بچہ اگر دورانِ تعلیم فیل ہو جائے تو والدین ان کی خفیہ صلاحیتوں کو ابھارنے کے بجائے یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ اس کا دل پڑھنے میں نہیں لگ رہا ہے اس لیے ان کا تعلیمی سلسلہ ختم کر کے عرب بھیج دیتے ہیں۔ یہ بالکل نہیں سوچتے ہیں کہ وہ خود ہی اپنے بچوں کے روشن مستقبل کو تاریکی میں ڈھکیل رہے ہیں، کیوں کہ یہ مسئلہ اب متفق علیہ ہو گیا ہے کہ روشن مستقبل کا دار و مدار تعلیم پر ہے، دولت پر نہیں۔

مسلمانوں کو درپیش مسائل اور ان کا حل:

نیپالی باشندے جمہوری اقتدار کی بنا پر حکومت سے اپنے اپنے مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے کی تگ و دو میں لگے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کو بھی چاہیے کہ اپنے درپیش مسائل کو سمجھیں اور ان کے حل کی تدبیریں سوچیں۔ ایسا نہ ہو کہ وقت نکل جائے اور سوائے کف افسوس ملنے کے کچھ باقی نہ بچے۔ مسلمانوں کے درپیش مسائل کی طرف توجہ دلا کر میں اپنے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

الف: مسلمانوں کے لیے ایک تعلیمی بورڈ کا قیام اشد ضروری ہے، جو ان کی صورتِ حال کا جائزہ لے کر تعلیمی ترقی کی راہ ہموار کرتا ہے۔

ب:- اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں اردو زبان کی تدریس کا سرکاری طور پر انتظام ہو۔

ج:- مدارس کو سرکاری امداد دلانا تاکہ مدارس اپنی ناگفتہ بہ حالت سے باہر نکل سکیں۔

د:- اسلامی تہواروں میں تعطیل کی منظوری کے لیے جد و جہد۔

ہ:- عقائد اہل سنت و جماعت کی تشہیر و تبلیغ۔

حل (الف):- علماے کرام ذاتی اختلافات کو مذہبی اختلافات کا رنگ دینے کے بجائے تقاضاے وقت کے مطابق قوم کے مفاد کے لیے انھیں ختم کرنے کی کوشش کریں اور یہ خیال ذہن سے نکال دیں کہ ان کی ذمہ داری مسجد و مدرسہ تک ہی ہے۔ بلکہ علما تو وارثین انبیا ہیں۔ انبیاے کرام نے ہر میدان میں مخلوقِ خدا کی رہ نمائی کی ہے۔ اسی طرح علما بھی امت کی بہتری کے لیے حکومت کے

کارندوں سے ملیں۔ تعلیمی بورڈ کے فوائد اور نہ ہونے کے نقصانات کو واضح کریں۔ میڈیا کا سہارا لے کر حکومت تک اپنی بات پہنچائیں۔ حکومت پر دباؤ ڈالیں اور جو علما عصری تعلیم سے آراستہ ہوں انھیں آگے بڑھا کر یہ ثابت کریں کہ علما میں صرف مسجد و مدرسہ ہی کی قیادت کرنے کی صلاحیت نہیں ہے، بلکہ ہر میدان میں وہ قائد ہو سکتے ہیں۔

ب:- اردو کو مقبولِ عام بنانے کے لیے رسالے اور یومیہ اخبار جاری کریں، ان اخبارات و رسائل کو حکومت تک پہنچائیں، اردو کی اہمیت کو واضح کریں۔ ایک سال سے بعض پرائیویٹ اسکولوں میں اردو پڑھانے والوں کا تقرر ہونے لگا ہے۔ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ مسلم بچے ان کے اسکول میں داخلہ لیں۔ اردو کی ترقی سے انھیں کوئی دل چسپی نہیں ہوتی۔

اردو کو گورنمنٹ کی منظوری دینے کے لیے پر زور کوشش کرنے کی ضرورت ہے تاکہ مدارس کے فضلا کو بھی اپنی صلاحیت کے جواہر پارے بکھیرنے کے مواقع ملیں۔

ج:- اس کے لیے ضروری ہے کہ مدارس کو رسمی تعلیم گاہ بنانے سے بچائیں کیوں کہ آج نیپال کے مدارس کا حال یہ ہے کہ سات آٹھ سال کا لمبا عرصہ مدارس میں گزارنے کے باوجود ان کی خفیہ صلاحیتیں نہیں نکھر پاتیں۔ جب گورنمنٹ کے سامنے انھیں پیش کریں گے تو وہ اپنی صلاحیتوں کا اظہار کھل کر نہیں کر سکیں گے اس لیے گورنمنٹ اس کی طرف توجہ دینے کو غیر ضروری سمجھے گی۔

لہٰذا مدارس میں ابتدائی تعلیم ہی دی جائے مگر بہتر طریقے سے تاکہ بچوں کا مستقبل برباد نہ ہو۔

بڑے بڑے دانش وروں اور حکومت کے کارندوں کو مختلف تقریبات کے مواقع پر مدعو کر کے انھیں مدرسے کے احوال تعلیمی شعبے اور دینی تعلیمات کی حقیقت کو واضح کریں تاکہ وہ خود سوچیں کہ واقعی مدارس اس قابل ہیں کہ ان کی امداد کر کے انھیں ترقی دینی چاہیے۔

د:- جمہوریت کے آنے کے بعد عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے موقع پر مسلمانوں کو ایک ایک دن کی چھٹی ملتی ہے، مگر دیگر تہواروں کے موقع پر چھٹی نہیں ملتی۔ مسلمانوں کی کوشش کے بغیر حکومت کو کیا غرض ہے کہ تعطیل دے۔

اس کے لیے مسلم لیڈران اور با اثر علما اگر تھوڑی کوشش کریں تو گورنمنٹ کی طرف سے اسلامی تہواروں میں چھٹیاں ہونے لگیں گی۔

ہ:- اہل سنت کی تشہیر کے لیے ضروری ہے کہ اسلامی تعلیمات کو عام کریں، میڈیا سے گریز کرنے کے بجائے اس پر علما کی پکڑ مضبوط ہو، صحافت میں حصہ لیں۔ اہل سنت کی کتابیں اور لٹریچر نیپالی زبان میں منتقل کر کے عوام کے ہاتھوں میں دیں۔ اور پہاڑی علاقوں میں نیپالی زبان میں تقریر کر کے انھیں اسلام کے صحیح خد و خال سے واقف کرائیں۔

نیز جمعہ اور دیگر تقریبات کے موقع سے الیف. ایم. پر اسلامی بیانات دیں تاکہ ناخواندہ حضرات بھی اسلامی تعلیمات سے آشنا ہوں۔

اسلامی تقریبات کے موقع پر نیپال کے اخبارات و رسائل میں مثبت انداز تحریر اپنا کر اسلامی معلومات قلم بند کریں تاکہ غیر مسلم بھی اسلام کی حقیقت کو جانیں۔

سرمایہ دار حضرات کی امداد سے فلاحی ادارے قائم کر کے اسلام کی اصل صورت پیش کریں جسے دشمنوں نے مسخ کر ڈالا ہے۔

با اثر علما عوام سے قریب ہوں، ان کی باتیں سنیں، ان کی امداد خود بھی کریں اور دوسروں کو بھی اس پر ابھاریں۔

ان تمام نکات پر سنجیدگی سے اور یکجا ہو کر سوچنے کی ضرورت ہے، ابھی جمہوریت ناپختہ ہے، اگر ہم ابھی پیش قدمی شروع کر دیں تو کوئی بعید نہیں کہ چند سالوں میں ہمیں اکثر حقوق مل جائیں، اس ضمن میں سب سے پہلے با اثر علما اور مسلم لیڈران قدم سے قدم ملا کر ملت کی بکھری ہوئی قوت کو یک جا کریں، منصوبہ بند، طریقے اور فراستِ مومنانہ سے کام لیتے ہوئے پیش قدمی کریں اور بقیہ کام اللہ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں۔ واللہ ہو الموفق وھو مقلب القلوب۔

بابری مسجد ملکیت مقدمہ

آستھا، انصاف یا سیاست

"بزمِ دانش" میں آپ ہر ماہ بدلتے حالات اور ابھرتے مسائل پر فکر و بصیرت سے لبریز نگارشات پڑھ رہے ہیں۔ ہم ارباب قلم اور علماے اسلام کو آواز دیتے ہیں کہ وہ دیے گئے موضوعات پر اپنی گراں قدر اور جامع تحریریں ارسال فرمائیں۔ غیر معیاری اور تاخیر سے موصول ہونے والی تحریروں کی اشاعت سے ہم قبل از وقت معذرت خواہ ہیں۔ از: مبارک حسین مصباحی

دسمبر ۲۰۱۰ء کا عنوان — اسلامی صحافت کے لازمی تقاضے

جنوری ۲۰۱۱ء کا عنوان — ہم کیسے منائیں عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم

کانگریس پارٹی مندر بنانے کا کریڈٹ لینا چاہتی ہے

ڈاکٹر بصیر احمد خاں

الہ آباد ہائی کورٹ کا فیصلہ آنے کے بعد عموماً مسلمانوں اور انصاف پسند ہندوؤں اور کئی ماہرین قانون نے اسے قانونی طور سے صحیح قرار نہیں دیا۔ کیوں کہ اس میں ایک فرقہ کی آستھا کو بنیاد بنا کر دستاویزات اور گواہیوں وغیرہ کو نظر انداز کیا گیا۔ ایک عجیب بات یہ بھی ہے کہ عدالت نے سنی وقف بورڈ اور نرموہی اکھاڑہ کے دعووں کو تکنیکی بنیاد پر خارج کر دیا اور ان دونوں کو ایک ایک تہائی زمین بابری مسجد کے مقام سے عطا بھی کر دی۔ ان تمام باتوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ عدالت نے قانون کی بالادستی کو نظر انداز کر کے ایک قسم کا پنچایتی فیصلہ دیا ہے۔ بہر حال مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں ہی نے اس فیصلے کے بعد امن کا دامن نہیں چھوڑا۔ یہی نہیں بلکہ سنی وقف بورڈ، مسلم پرسنل لا بورڈ، نرموہی اکھاڑہ اور ہندو مہا سبھا وغیرہ نے یہ اعلان بھی کر دیا ہے کہ وہ اس فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کریں گے۔ قانونی اعتبار سے یہ موقف اس لیے صحیح ہے کہ عدالتی چارہ جوئی میں دو ہی راستے ہیں، یا تو ہائی کورٹ کا فیصلہ مان لیا جاتا ورنہ سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی جائے۔ کچھ لوگوں کا یہ مشورہ بھی آیا کہ فیصلہ آنے کے باوجود کوئی سمجھوتے کی راہ نکالی جائے۔ لیکن اہم سوال یہ ہے کہ اس میں صرف دو متفقہ فریق تو ہیں نہیں جو مصالحت کرنے کے مجاز ہوں۔ اس لیے یہ بات طے ہے کہ معاملہ سپریم کورٹ میں ضرور جائے گا، اس کے باوجود وشو ہندو پریشد یہ اعلان کر رہی ہے کہ وہ اجودھیا میں کسی اور مسجد کی تعمیر نہیں ہونے دیں گے۔ ان کا مطالبہ ہے کہ حکومت پارلیمنٹ میں قانون بنا کر شہید کی گئی مسجد کے مقام پر مندر تعمیر کرنے کی راہ ہموار کرے اور جو اراضی حکومت نے اکوائر کی ہے وہ زمین بھی مندر کو دے دے۔

انھوں نے اپنے اس موقف کی حمایت میں سادھو سنتوں کا سمّیلن اجودھیا میں منعقد کر کے اس معاملے کو عوام میں لے جانے کا ارادہ بھی ظاہر کر دیا ہے۔ دراصل بابری مسجد کی جگہ رام مندر کی تحریک بھی وشو ہندو پریشد اور سنگھ پریوار کی سیاسی جماعت بی۔ جے۔ پی۔ نے ہی چلائی

تھی۔ اس کے جواب میں مختلف بابری مسجد کمیٹیاں وجود میں آ گئیں۔ یو پی میں مرحوم سید مظفر میاں کچھوچھوی سابق ممبر پارلیمنٹ اس کے صدر بنے اور ظفریاب جیلانی اور ان کے ہم زلف اعظم خاں اس کے کنوینر قرار پائے۔ ادھر مرکز میں سید شہاب الدین نے کمان سنبھالی۔ ایک طرف وشو ہندو پریشد، شیوسینا نے ہندوؤں کو اکسانا اور ابھارنا شروع کیا تو دوسری طرف سے بابری مسجد ایکشن کمیٹیاں جلسے، جلوس اور کنوینشن کرنے لگیں۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ سنی وقف بورڈ اور ہاشم انصاری اس وقت بھی مقدمہ لڑ رہے تھے۔ وی ایچ پی اور بی جے پی کی چال یہ تھی کہ اس معاملے کو ہندو اور مسلمانوں کا عوامی مسئلہ بنا دیا جائے تاکہ انھیں اکثریت کی حمایت حاصل ہو جائے اور وہ اقتدار پر قبضہ کریں۔ یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ جب مسلمان مقدمہ لڑ رہے تھے تو اس وقت یہ موقف کیوں نہیں اپنایا گیا کہ ہم عدالت کا فیصلہ مانیں گے۔ یہ بات ہمارے علماے کرام اور بابری مسجد ایکشن کمیٹیوں کی سمجھ میں اس وقت کیوں نہیں آئی۔ اس وقت بھی ایک شخص نے سید شہاب الدین سے بحث کی تھی کہ ایک طرف آپ مقدمہ لڑ رہے ہیں اور دوسری طرف آپ جلسے جلوس، مظاہرے اور کنوینشن کر رہے ہیں۔ عدالت یہ تو نہیں دیکھے گی کہ آپ نے کتنے جلسے کیے اور کتنے مظاہرے کیے۔ اس سے تو وی ایچ پی اور بی جے پی کو فائدہ ہوگا۔ کیوں کہ وہ اس مسئلہ کو سڑکوں پر لا کر عوامی بنانا چاہتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جو ہندو رام چندر کو بھگوان مان کر ان کے سیوک اور بازسینا کے ہنومان کی پوجا کرتے ہیں، وہ اس معاملہ میں رام مندر اجودھیا میں بنانے کی تحریک سے متاثر ہوں گے۔ یہ معاملہ عوام میں آ کر ہندو مسلم مسئلہ بنے گا۔ آپ کے جلسے جلوس سے ان کے جلسوں، جلوسوں اور رتھ یاترا کو زیادہ عوامی حمایت ملے گی۔ اگر اس وقت یہ موقف اختیار کیا ہوتا کہ ہم عدالت مین مقدمہ لڑ رہے ہیں اور عدالت کا فیصلہ مانیں گے تو وی ایچ پی اور بی جے پی ہندوؤں کو مشتعل کرنے میں اتنی کامیاب نہیں ہوتی۔

بابری مسجد کی شہادت سے پہلے کے حالات پر غور کیجیے۔ سید مظفر میاں کچھوچھوی (علیہ الرحمہ) نے بیان دیا ڈالا کہ جب ہم بابری مسجد کو بچانے کے لیے کوچ کریں گے تو راستے میں کوئی مندر نہیں بچے گا۔ بوٹ کلب کی ریلی میں مرحوم سید عبد اللہ بخاری نے فرمایا کہ یہ جو سامنے انسانوں کو ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے، اگر میں اشارہ کر دوں تو وزیروں کی کوٹھیوں میں گھس جائیں گے وغیرہ وغیرہ۔ جب سید شہاب الدین نے اٹھ کر انھیں ٹوکنا چاہا تو ان کے کندھے پر ہاتھ مار کر جھڑک دیا اور پوری دنیا نے یہ منظر دیکھا اور پھر بابری مسجد ایکشن کمیٹی ایک سے دو ہو گئی۔ سید شہاب الدین نے اس کا نام بابری مسجد تحریک رابطہ کمیٹی رکھ دیا۔ اور بابری مسجد ایکشن کمیٹی نے مرحوم سید عبد اللہ بخاری کو اپنا سرپرست بنا لیا۔ دہلی کی جامع مسجد میں کفن پہن کر اعلانات ہوئے، سیاہ جھنڈے لہرائے گئے۔ اجودھیا کوچ کرنے کے لیے رضا کاروں کا نام لکھنے کی مہم چلی۔ اخبارات اور ٹی وی پر بیانات اور تصویریں آنے لگیں اور جب اجودھیا میں کارسیوکوں کا اژدحام ہوا اور بابری مسجد شہید ہو گئی تو وہاں ہمارا کوئی آدمی موجود نہیں تھا۔ فسادات ہوئے، ہزاروں مسلمان شہید کیے گئے اور تب ایکشن کمیٹیوں کو مقدمہ یاد آیا۔

اب جب کہ مقدمہ کا فیصلہ ہائی کورٹ سے آ گیا اور مسلم تنظیموں نے اعلان کر دیا کہ سپریم کورٹ میں اپیل کی جائے گی تو خدارا پچھلی غلطیوں کو نہ دہرایا جائے۔ بابری مسجد مسئلے پر جلسے، سیمینار اور کنوینشن کرنے سے سپریم کورٹ میں مقدمے پر تو اثر پڑنے سے رہا۔ چاہے رام لیلا میدان میں عوامی عدالت لگائی جائے، پریس کانفرنسیں کی جائیں، یا ٹی وی پر بیانات دیے جائیں، اس سے وشو ہندو پریشد اور بی جے پی کو ہی فائدہ ہوگا، کیوں کہ وہ اسے عوام میں لانا چاہتے ہیں۔ کیوں کہ اس کے سہارے وہ ملک کے اقتدار پر قابض ہوئے تھے، اور آج وہ اس ملک کی دو بڑی سیاسی جماعتوں میں سے ایک ہیں۔ جب مقدمہ ہی لڑنا ٹھہرا تو قابل ترین وکلا کو کھڑا کیا جائے۔ کم از کم ملک میں امن درہم برہم نہیں ہوگا اور اتمامِ حجت ہو جائے گی، بحیثیت مسلمان ہم حتی المقدور اسی کے مکلف ہیں۔ ویسے میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ کانگریس پارٹی مندر بنوانے کا کریڈٹ لینا چاہتی ہے اور اس کے لیے وہ آخری حربہ کے طور پر پارلیمنٹ سے قانون بھی بنوا سکتی ہے۔ اس وقت مسلم اراکین پارلیمان کا امتحان ہوگا۔ ویسے اس کا ماضی کا ریکارڈ تو بالعموم دو ایک کو چھوڑ کر مایوس کن ہی رہا ہے۔ حال ہی میں خواتین ریزرویشن

یہ عدالت کا نہیں بلکہ سیاست کا فیصلہ ہے

ڈاکٹر سلیم خان

بابری مسجد کے قضیہ میں الہ آباد ہائی کورٹ کا فیصلہ سن کر بے ساختہ گاندھی جی کے تین بندر یاد آ گئے جو کبھی بھی ایک دوسرے سے اتفاق نہیں کرتے۔ ایک کا ہاتھ منہ پر ہوتا ہے تو دوسرے کا کانون پر اور تیسرا بے چارہ آنکھیں موند کر بیٹھا رہتا ہے۔

ہائی کورٹ کے جس فیصلے پر تین جج حضرات آپس میں اتفاق نہ کر سکے، اس سے بھلا ہندو اور مسلم عوام کے درمیان اتحاد و اتفاق کیوں کر بحال ہو سکتا ہے؟ لیکن اس کے باوجود سیاست داں اس کی تلقین کر رہے ہیں، میڈیا اسے نہ صرف دوہرا رہا ہے بلکہ توقع بھی کر رہا ہے کہ ایسا ہوگا۔ اگر سیاست سے عدل کا خاتمہ ہو جائے اور عدالت گھٹیا سیاست کی بھینٹ چڑھ جائے تو کیا ہوتا ہے؟ اگر کوئی جاننا چاہتا ہو تو بابری مسجد کی سیاست اور عدالت کے فیصلوں کو دیکھ لے۔ حالیہ فیصلے نے نہ صرف مسلمانوں بلکہ ہندوؤں کو بھی چونکا دیا ہے۔ مسجد گرا کر مندر بنانے والے جو عدالت میں پیش ہونے والے دلائل اور ثبوت سے گھبرا کر یہ کہہ رہے تھے کہ ہم اپنے خلاف ہونے والے کسی فیصلے کو تسلیم نہ کریں گے۔ اگر عدالت مندر کے حق میں فیصلہ نہیں کرتی تو دستوری ترمیم کی مدد سے اس کی راہ ہموار کی جائے گی۔ جو خوف کے مارے فیصلے کو ٹالنے کی گہار لگا رہے تھے اور عدالت کے باہر سمجھوتے کی تجویز رکھ رہے تھے۔ وہ سب اس فیصلے سے پھولے نہیں سما رہے ہیں۔ اور عدلیہ پر مکمل اعتماد کا اظہار کرنے والے مغموم و مایوس ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی کو اس عدالتی قلابازی کی توقع نہیں تھی۔ سب جانتے تھے کہ اگر فیصلہ ثبوت و برہان کی بنیاد پر ہوا تو یقیناً اس سے مختلف ہوگا۔

مسلمان بے چارے بہت خوش تھے کہ اس بار اتر پردیش میں ان کی بہن مایاوتی کا راج ہے۔ مرکز میں سیکولرزم کی سرغنہ کانگریس کی حکومت ہے جسے بڑے ارمانوں کے ساتھ وہ اقتدار میں لائے ہیں۔ ملک کے ہندو عوام کی دل چسپی رام مندر میں ختم ہو چکی ہے اور ماحول سنگھ پریوار کے خلاف ہو گیا ہے۔ آئے دن دہشت گردی کے معاملات میں سنگھی رہ نماؤں کا ملوث ہونا منظر عام پر آ رہا ہے۔ جس سے ان کے حوصلے پست ہوتے جا رہے ہیں۔ وشو ہندو پریشد کو کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ برسوں سے ان لوگوں نے دھرم سنسد کا ڈرامہ تک نہیں کیا ہے۔ بی جے پی شدید قحط الرجال کا شکار ہے۔ پرانے رہ نماؤں کی ہوا اکھڑ چکی ہے، نئے لوگوں میں دم خم نظر نہیں آتا، پارٹی کے اندر اختلاف کا بول بالا ہے، بی جے پی کو اس بات کا بھی خوف لاحق ہے کہ کہیں خود کانگریس ایسی ریاستوں میں جہاں ان کی حکومت ہے فرقہ وارانہ فسادات کروا کر حفظ و امان کا مسئلہ پیدا نہ کر دیں اور مرکز کو کسی طرح ان کی حکومت برخواست کرنے کا موقع ہاتھ آ جائے۔ اس لیے بی جے پی والے بھی فساد کے بجائے امن کی بولی بولنے لگیں۔

بابری مسجد کا قضیہ عدل و انصاف کے ساتھ چکانے کے لیے اس سے زیادہ سازگار ماحول پھر کبھی میسر آ جاتا۔ یہ شاید ہی ممکن تھا، اس لیے اس بار انصاف کی توقع کی قدرے اضافہ ہو گیا تھا۔ لیکن جو لوگ کانگریس کی تاریخ سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ کانگریس کے لیے عدل و انصاف کی کوئی اہمیت و وقعت کبھی بھی نہیں رہی ہے۔ عدل کو قائم کرنے کے لیے جو ہمت و حوصلہ درکار ہوتا ہے، اس جماعت کے اندر اس کا ہمیشہ ہی فقدان رہا۔ کانگریس کی تمام تر دل چسپیاں اقتدار کے دائرے میں محصور ہوتی ہیں۔ اس کے دور میں تمام فیصلے سیاسی مفاد کے پیش نظر کیے جاتے ہیں اور کانگریس اس بات سے واقف ہے کہ جمہوری نظام حکومت میں انصاف کرنے سے زیادہ اہمیت اکثریتی فرقہ کی خوش نودی حاصل کرنے کو حاصل ہے۔ اس لیے اس نے ماضی میں بھی انصاف کو اپنے قدموں تلے روندا اور اس بار بھی یہی کیا۔ یہ عدالت کا نہیں بلکہ سیاست کا فیصلہ ہے۔

سونیا گاندھی کو ایسا لگ رہا ہے کہ اس سے راہل گاندھی کے وزیر اعظم بننے کا راستہ صاف ہو گیا، لیکن انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ راجیو گاندھی کے اقتدار سے محرومی کا ایک سبب بابری مسجد کا تالہ کھلوانا بھی تھا۔

کانگریس پارٹی کے پرچم کے تین رنگ ہیں۔ اسی طرح اس مقدمہ کے تین قاضی تھے۔ شرما جی نے زعفرانی دھوتی باندھ رکھی تھی اور اگروال صاحب نے سفیدی مائل کرتا پہن رکھا تھا۔ خان صاحب نے ہرے رنگ کی ٹوپی اپنے سر پر سجا رکھی تھی۔ اس ڈرامے میں ان تینوں کو مختلف کردار نبھانا تھا۔ اس حساب سے انھیں مختلف ملبوسات میں نوازا گیا تھا اور فیصلے دیکھنے کے بعد اس بات کو تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں محسوس ہوتی کہ ان تینوں حضرات نے مقدمہ کے ساتھ تو نہیں لیکن اپنے اپنے کردار کے ساتھ ضرور انصاف کیا۔

ان لوگوں نے مشترکہ فیصلہ سنانے کے بجائے علاحدہ فیصلے سنائے تاکہ اپنی انفرادیت کو باقی رکھا جا سکے اور عوام کو اس کے حوالے سے کوئی غلط فہمی نہ ہو کہ کون سی رائے کس شخص کی ہے۔ یہ منظر نامہ اس حقیقت کا غماز ہے کہ ہندو معاشرہ دو حصوں میں تقسیم ہے۔ ایک سیکولر، یعنی بے دین اور دوسرا دین دار یعنی سنگھ پریوار اور ان تینوں کو ہندوستانی سیاست میں یکساں اہمیت حاصل ہے۔ لیکن اس بندر بانٹ کا فائدہ بالآخر ہندوؤں کو ہی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اگر تقسیم برابر بھی ہو جائے تب بھی دو تہائی ان کے حصے میں چلا جاتا ہے اور مسلمانوں کے حصہ میں ایک تہائی آتا ہے۔ اس پر جمہوری نظام کی قہر سامانی اپنی جگہ ہے جو فی صد کو صد فی صد اقتدار سے نوازتا ہے اور فی صد کو پوری طرح بے اختیار کر دیتا ہے۔

کانگریس کی پرمپرا کا جنھیں علم ہے وہ اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ اگر کانگریس چاہتی تو یہ مسئلہ پیدا ہی نہیں ہوتا۔ انگریزی سامراج کے دوران ایک ہندو اور دو انگریز جج جو نا انصافی نہ کر سکے اور ہندوؤں کی عرض داشت کو تین مرتبہ خارج کر دیا وہ کام کانگریسیوں نے مسلسل کیا۔ مورتیوں کو جب رکھا گیا تو اس وقت مرکز میں اور ریاست میں کانگریس کی حکومت تھی۔ سنگھ پریوار نہایت کم زور اور لاغر تھا۔ اگر پنڈت نہرو گووند بلبھ پنت کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے مورتیاں ہٹا دیتے تو معاملہ بڑی آسانی سے رفع دفع ہو جاتا، لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ مورتیوں کو ہٹانے کے بجائے مسلمانوں کو عبادت سے روک دیا گیا۔ اس کے بعد غیر قانونی مندر کا تالہ راجیو گاندھی نے اپنے وزیر اعلیٰ این ڈی تیواری کے زمانے میں کھلوایا اور شیلا نیاس کروا کر اعلان کیا مندر وہ (مراد بی جے پی) نہیں ہم بنائیں گے۔ بلکہ رام راجیہ کے قیام کا اعلان بھی کر گزرے۔ ان کے بعد جب نرسمہا راؤ برسرِ اقتدار آئے تو انھوں نے جان بوجھ کر بی جے پی کو مسجد شہید کرنے کا موقع دیا تاکہ اس سلگتے ہوئے مسئلہ کو ٹھنڈا کر دیا جائے، جس کی مدد سے بی جے پی اقتدار میں آنا چاہتی ہے اور مسجد کی شہادت کے دوران گم سم مونی بابا بنے رہے۔

جب مسجد ڈھیر ہو گئی تو غیر قانونی طور پر بنائے گئے کارگزار مندر کو ہٹانے کے بجائے جس کا مشورہ جیوتی باسو نے انھیں دیا تھا، نیز اپنے تعاون کا یقین بھی دلایا تھا، بی جے پی نے چار ریاستی حکومتوں کو برخواست کر کے اپنی سیاسی ابن الوقتی کا مظاہرہ کیا۔ انھوں نے لال قلعہ سے مسجد کی تعمیر کا وعدہ کیا۔ بعد میں جب ان سے پوچھا گیا، مندر کا کیا ہوگا؟ تو وہ بولے مندر بھی رہے گا۔ اس کے بعد جب پوچھا گیا پھر مسجد کیسے بنے گی؟ تو بولے میں نے یہ کب کہا مسجد وہیں بنے گی۔ ان کے بعد آنے والی سونیا کے کٹھ پتلی من موہن سنگھ نے وہی کیا جو راؤ نے کیا تھا۔ بابری مسجد کی زمین کو عدالت کے ذریعہ تقسیم کروا کر بالآخر وہاں مندر کی تعمیر کا راستہ صاف کر دیا۔ وقت کے ساتھ افراد و کردار بدلتے رہے، لیکن افکار و طریقہ کار میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، اس لیے کہ اغراض و مقاصد ہمیشہ ہی اقتدار کو حاصل کرنا اور اسے باقی رکھنا ہے۔ ایسے مسلمانوں کی حالت پر فیض کا یہ شعر صادق آتا ہے ؎

بنے ہیں اہلِ ہوس مدعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں

کانگریس کی یہ روایت بہت پرانی ہے۔ آزادی سے قبل بھی اس کے پاس گاندھی جی کے تین بندروں کی مانند تین رہ نما تھے، جن کی مدد سے سیاست کھیلی جاتی تھی۔ جج اگروال سے مشابہت رکھنے والے پنڈت نہرو، شرما جی کی طرح دکھائی دینے والے سردار پٹیل اور خان صاحب کی جگہ مولانا آزاد براجمان تھے اور ان تینوں کی مدد سے ملک کو اسی طرح تقسیم کیا گیا تھا جیسے آج بابری مسجد کی زمین کو تقسیم کر دیا گیا۔ اس وقت بھی مسلمانوں کے حصے میں تقریباً ایک تہائی اور ہندوؤں کو دو تہائی حصہ ملا تھا۔

تین جج حضرات کی بنچ کے فیصلوں کا گاندھی جی کے تین بندروں کے رویہ سے موازنہ دل چسپی سے خالی نہیں ہے۔ خان صاحب نے برائی کو دیکھا اور سنا لیکن بولنے سے قدرے گریز کیا اور برامت بولو کی نصیحت پر عمل کیا۔ یہ تو کہا کہ بابری مسجد کو بنانے کے لیے کسی مندر کو توڑا نہیں گیا۔ وہاں پر اس وقت کوئی مندر نہیں تھا۔ یہ بھی کہہ گئے کہ دسمبر کی رات میں وہاں مورتیاں لا کر رکھی گئیں۔ لیکن یہ نہ کہہ سکے کہ مورتیوں کو وہاں

لاکر نصب کرنا اولین غلطی تھی۔ اور دوسری غلطی اس وقت ہوئی جب عدالت کی مدد سے مسجد کا تالہ کھلوا کر وہاں پوجا کی اجازت دی گئی اور تیسری غلطی کے وقت سپریم کورٹ میں کی گئی یقین دہانی کو بالائے طاق رکھ کر ۶ ردسمبر ۱۹۹۲ء کے دن بابری مسجد کو شہید کر دیا گیا، اور وہاں رام جی کا غیر قانونی مندر بنا دیا گیا۔ اب چوتھی غلطی خود انھوں نے کی اور اپنے فیصلے میں یہ لکھ دیا کہ متنازعہ زمین کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا جائے، جس میں سے ایک حصہ مسلمانوں کو دے دیا جائے، اسی کے ساتھ مورتیوں کو اپنی جگہ سے نہ ہٹایا جائے۔ یہ مورتیاں دوسرے دو ججوں کے لیے آستھا کا معاملہ تھیں، لیکن خان صاحب کے لیے محض ملازمت کا سوال تھا اور وہ اسے قربان نہیں کر سکے۔ ان کے منہ پر ترنگی سیاست کا تالا پڑا ہوا تھا۔

شریمان اگروال نے برامت دیکھو پر عمل کرتے ہوئے برائی کی جانب سے آنکھیں بند کر رکھی تھیں، صرف برا بھلا سنا اور وہی کچھ بول گئے۔ انھوں نے کہا کہ رام کی جائے پیدائش وہی ہے جہاں مورتیاں نصب کی گئی ہیں، اس لیے کہ ہندو کا یہ عقیدہ و ایمان ہے۔ دراصل اگروال صاحب یہ بھول گئے کہ ان سے یہ بات پوچھی ہی نہیں گئی تھی کہ ہندوؤں کا عقیدہ کیا ہے؟ اور اگر کسی کا عقیدہ یہ ہو کہ الہ آباد کی عدالت لکھنؤ کے بجائے نیویارک میں بیٹھ کر فیصلہ سنا رہی ہے تو اس سے لکھنؤ نیویارک نہیں بن جاتا۔ آستھا کی بنیاد پر زمین کا مالکانہ حق طے نہیں ہوتا۔ اس لیے انھوں نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے کے بجائے دودھ میں اس قدر پانی ملا دیا کہ انصاف کی دیوی شرم سے پانی پانی ہوگئی۔ انھوں نے چوں کہ حقائق سے آنکھیں بند کر رکھی تھیں اس لیے یہ بول گئے کہ متنازعہ عمارت (بابری مسجد) کے اندر دونوں مذاہب کے ماننے والے عبادت کیا کرتے تھے، لیکن باہر کے حصے کو جسے صرف ہندو استعمال کرتے تھے، نرموہی اکھاڑے کو ورادان کر دیا جائے۔

اگروال صاحب کا یہ قیاس سراسر زمینی حقائق سے ٹکراتا ہے۔ اگر وہ عدالت کے گزشتہ مقامات کو بھی دیکھ لیتے تو ان پر یہ حقیقت عیاں ہو جاتی کہ مسجد کے اندر تک صرف اور صرف مسلمان عبادت کرتے رہے۔ اس کے بعد عدالت نے رام کی مورتی کو بھوگ لگانے کا حکم دیا۔ اس سے قبل وہاں کبھی بھی ہندوؤں نے عبادت نہیں کی۔ لیکن عدالت کے فیصلوں کو بھلا وہ شخص کیسے پڑھ سکتا ہے جس کی آنکھ پر پٹی بندھی ہو۔ شرما جی کے کانوں میں کانگریس نے سیسہ گھول کر پلا دیا تھا، اس لیے ان کو کوئی گواہی سنائی نہیں دیتی تھی، ان کی آنکھوں پر اس قدر گہری زعفرانی عینک چڑھی ہوئی تھی کہ ان کو ہر شے میں زعفرانی رنگ نظر آتا تھا اور ان کے ہر لفظ سے گیروا کذب ٹپکتا تھا۔ شرما جی نے بڑی ڈھٹائی سے یہ کہہ دیا کہ بابر نے رام مندر کو توڑ کر وہاں مسجد بنائی تھی، اس لیے اسلامی شریعت کے مطابق وہاں مسجد کی تعمیر ہی غلط تھی۔ ان کی اندھی عقیدت کا یہ مظہر بھی قابلِ ذکر ہے کہ ایک طرف تو یہ مانا کہ رام کی مورتی کو مسجد میں رکھا گیا، لیکن یہ بھی کہا کہ رام کی پوتر آتما اس جگہ ہمیشہ ہی موجود تھی۔ اس لیے شرما جی نے اس پورے خطۂ اراضی کو بلا شرکت غیرے رام مندر کی تعمیر کے لیے وقف کرتے ہوئے سنی وقف بورڈ کا دعویٰ سرے سے خارج ہی کر دیا۔ وہ شرما جی کی ملازمت کا آخری دن تھا، اس لیے انھوں نے حکومت کی مرضی سے انحراف کرنے کی جراتِ رندانہ کر ڈالی۔ حکومت نے اسے برداشت کر لیا اس لیے کہ اس سے کوئی فرق نہیں واقع ہوتا تھا یا ممکن ہے ان کے لیے حکومت نے اسی طرح کی کردار نگاری کی ہو۔ گویا کہ تینوں جج صرف ایک بات پر متفق تھے کہ رام کی مورتی کو اپنی جگہ سے نہ ہٹایا جائے۔ اس طرح گاندھی جی کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے ان تینوں نے اپنے اپنے طریقہ سے متفقہ طور پر انصاف کی دیوی کو آستھا کی سولی پر لٹکا دیا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ الہ آباد بنچ کا یہ فیصلہ عدالتی نہیں بلکہ سیاسی تھا اور اس سے انھیں لوگوں کو مایوسی ہوئی جو کانگریس پارٹی کی تاریخ کو بھلا کر اس سے غلط توقعات باندھے ہوئے تھے۔ اس فیصلے سے جو پیغام جاتا ہے وہ اس طرح ہے کہ جمہوری ہندوستان میں آپ کسی کی عبادت گاہ میں منہ اندھیرے مورتیاں ڈال دیں، پھر عدالت میں جا کر اس کو قفل لگوا دیں، پھر تالہ کھلوانے کے لیے تحریک چلائیں۔ اس کے بعد رتھ یاترا نکال کر اس عمارت کو مسمار کر دیں۔ فسادات کروا کر لوگوں کو دہشت میں ڈال دیں۔ حکومت مجرمین کو سزا دینے کے بجائے مخالفین کی حکومت برخواست کر کے اپنا سیاسی مقصد حاصل کر لے۔ حقائق کی تفتیش کے لیے، جسے ساری دنیا نے ٹیلی ویژن پر دیکھا ہو، کمیشن قائم کر دیا جائے گا اور برسوں کی تحقیقات کے بعد کوئی وظیفہ یافتہ جج مجرمین کی نشان دہی کرے گا، سرکار ان کے خلاف کوئی اقدام نہیں کرے گی بلکہ اس کی آنچ پر اپنی سیاسی روٹیاں سینکے گی اور جب مناسب سمجھے گی انصاف کا پوسٹ مارٹم کر کے اس کی لاش کو تقسیم کر دیا جائے گا۔

گاندھی یونیورسٹی کا کوئی ریسرچ اسکالر اگر گاندھی جی کے تین بندروں پر اپنی تحقیق کا موضوع بنائے تو نہایت دل چسپ حقائق اس کے سامنے

آئیں گے۔ خود ڈارون بھی ان انکشافات سے حیران رہ جائے گا۔ اس کے مفروضے کی زنجیر کا غائب چھلہ اس تحقیق کے نتیجے میں اس کو حاصل ہو جائے گا۔ مثلاً اس تحقیق کا پہلا سوال یہ ہوگا کہ آخر گاندھی جی کو ان تین کاموں کے لیے تین بندروں کی ضرورت کیوں پڑی؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کوئی ایک ہی بندر یہ تینوں کام کر دیتا؟ اور پھر اس کو کرنا تو کچھ تھا نہیں۔ گاندھی جی نے انھیں یہ تو نہیں کہا تھا کہ اچھا بولو، یا اچھا سنو اور اچھا دیکھو، بلکہ تین بری باتوں سے روکنے کا اپدیش دیا تھا، بس۔ سو کیا ملک کی اس عظیم آبادی میں انھیں کوئی ایک بندر بھی ایسا میسر نہ آیا جو ان تینوں برائیوں سے اپنے آپ کو روک پاتا؟ تا کہ وہ اسے علامت کے طور پر پیش کر سکتے؟ وہ محقق اگر اس سوال کا جواب حاصل کرنے کی خاطر کانگریس پارٹی دانش وروں سے رابطہ قائم کرے تو اسے بتلایا جائے گا کہ مہاتما جی نہایت حقیقت پسند آدمی تھے، انھوں نے یہ نصیحت کانگریس پارٹی کے کارکنان کو کی تھی اور وہ جانتے تھے کہ اس کلیگ کے سیاست داں سر سے پیر تک برائیوں میں لت پت ہیں، اگر ایسے میں وہ ان کی کوششوں سے کسی ایک آسان سی برائی سے بھی بچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو یہ بہت بڑی کامیابی ہوگی۔ گاندھی جی جیسے بھی تھے، لیکن تھے نہایت دور اندیش آدمی۔ آزادی سے قبل انھوں نے جمہوری نظام کے اثرات کا اندازہ لگا لیا تھا۔ آج اگر وہ اپنی پیشن گوئی کو الہ آباد عدالت کے اندر حقیقت میں بدلتے دیکھتے تو یقیناً ان کی آتما کو بڑی شانتی ملتی۔ گاندھی جی شاید یہ نہیں جانتے تھے کہ انسان کے پاس آنکھ کان اور زبان کے علاوہ ہاتھ، پیر اور سر بھی ہوتا ہے، اور ان کے ذریعہ سے بھی لوگ برائیوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اور پھر دل، دماغ اور دیگر اعضائے رئیسہ، ان کا کیا کہنا، وہ تو بڑی بڑی برائیوں کی آماجگاہ ہوتے ہیں، لیکن کانگریس کی شریعت میں ان عظیم برائیوں کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ کانگریس کی پراچین سنسکرتی کو جب جمہوری لباس میسر آجاتا ہے، اس کے مضرات میں سیکڑوں گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ عدلیہ، انتظامیہ اور مقننہ بھی گاندھی جی کے تین بندروں کی طرح اپنا اپنا کردار نبھانے لگتے ہیں۔ ان میں سے عدلیہ کی آنکھ پر پٹی بندھی ہوتی ہے۔ وہ برائی کی جانب آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا، لیکن جھوٹے گواہوں کی باتوں کو سن کر غلط سلط فیصلے سنانے سے گریز نہیں کرتا۔ انتظامیہ کا حال یہ ہوتا ہے کہ برائی کو دیکھتا ضرور ہے اور بری باتیں سنتا بھی ہے لیکن اپنی زبان کو اس کے خلاف کوئی جنبش نہیں دیتا۔ اس کے منہ پر تالا پڑا ہوتا ہے۔ اور مقننہ کی دنیا ہی نرالی ہوتی ہے۔ وہ کسی کی ایک نہیں سنتا اس کے کانوں میں روئی پھنسی ہوتی ہے۔ وہ برائیوں کو چشم زدن سے دیکھتا ہے اور بے تکان اول فول بکتا رہتا ہے۔ اس نظامِ حکومت میں کسی کو بھی گاندھی جی کی طرح برائی کو روکنے میں کوئی دل چسپی نہیں ہوتی، ہر کوئی برائیوں کا استحصال کرنے میں جٹا رہتا ہے اور حسب ضرورت انھیں فروغ دینے سے بھی نہیں کتراتا۔ اس باب میں ایک اہم اضافہ اس وقت ہوا جب گرو گوالکر کے شاگردوں نے وقتی طور پر گاندھیائی سوشلزم کا چولہ پہنا۔ انھوں نے یہ کہا کہ ایک ہی بندر کے لیے تین مکھوٹے بنا دیے، جو وقتِ ضرورت انھیں اپنے چہرے پر چڑھا لیتا تھا، اس لیے کبھی تو ایسا دکھائی دیتا تھا کہ اس کا منہ ہاتھ پر رکھا ہوا ہے، اور کبھی لگتا تھا وہ کانوں پر ہاتھ رکھے ہوئے ہے اور کبھی کبھار اس کے ہاتھ آنکھوں پر بھی نظر آجاتے تھے۔ حالاں کہ ان کے حواسِ خمسہ ہمیشہ ہی اقتدار کی جانب متوجہ رہتے۔ اس معاملے میں ساری سیاسی جماعتیں یکساں ہیں۔ کسی کو کسی پر کوئی امتیاز حاصل نہیں۔ اس لیے بابری مسجد کے فیصلے پر تمام لوگوں کا ردِ عمل تقریباً یکساں ہے۔ مسئلہ افراد یا جماعتوں کا نہیں بلکہ نظام کا ہے۔ اس نمک کی کان میں جو بھی جاتا ہے نمک بن جاتا ہے۔

جمہوری نظام کے اندر سیاسی رہ نماؤں کی جو مجبوری ہوتی ہے وہ چار سو سال قبل پرانے شاہی نظام میں نہیں تھی۔ اس کے باوجود بابر نے اپنے بیٹے ہمایوں کو وصیت کی تھی کہ ہندو عوام کے جذبات و احساسات کا خیال رکھنا۔ لیکن عدالت کے حالیہ فیصلے کے بعد کیا آج کا بابر بھی اپنے بیٹے کو وہی تلقین کر سکے گا؟ وہ تمام لوگ جن میں ڈاکٹر موہن بھاگوت سے لے کر شاعر جاوید اختر شامل ہیں اور جو ماضی کو بھلا کر مستقبل کی طرف دیکھنے کی بات کرتے ہیں، انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ چار سو سال پرانے بابر نے تو کسی مندر کو توڑ کر وہاں مسجد تعمیر نہیں کی تھی، لیکن کیا چار سو سال بعد آنے والا بابر اس مسجد کو بھول جائے گا جسے توڑ کر اس کی جگہ مندر کی تعمیر کی گئی ہو؟ یہ سوال کسی تحقیق کا محتاج نہیں ہے۔ اس کا جواب سب جانتے ہیں۔ سنی وقف بورڈ نے مجبوراً سپریم کورٹ میں جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ ممکن ہے ہندو فریق بھی وہاں پہنچ جائے اور پھر ایک بار نئی مہابھارت چھڑ جائے، لیکن سپریم کورٹ کے بعد اس دنیا کے تمام عدالتی دروازے بند ہو جائیں گے۔ لیکن مسجد کی بازیابی کی تحریک ختم نہ ہوگی۔ وہ تحریک مسجد کی تعمیر نو تک جاری رہے گی لیکن سپریم کورٹ کے ناموافق فیصلے کے بعد کا مرحلہ خاصہ تلخ ہوگا۔

☆☆☆☆☆

نقد و نظر

تبصرے کے لیے کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہے

نام کتاب	:	**ایضاحِ حقیقت**
مصنف	:	حضرت علامہ وجیہ الدین گجراتی علیہ الرحمہ
شارح	:	شیخ عبدالعزیز خالدی رحمۃ اللہ علیہ
مترجم	:	مولانا نصر اللہ رضوی مصباحی
صفحات	:	۳۰۴ قیمت: ۱۵۰/روپے
ناشر	:	المجمع الاسلامی، ملت نگر، مبارک پور اعظم گڑھ (یو۔پی)
مبصر	:	محمد طفیل احمد مصباحی

اس دور کو Clash of Civilization یعنی تہذیبی تصادم کا دور کہا جاتا ہے۔ تہذیبی تصادم کا معنی سوا اس کے اور کیا ہوسکتا ہے کہ زندگی کے تمام شعبوں میں مادیت کی حاکمیت اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہوئے روحانیت کے پاکیزہ اصول کو یک لخت مسترد کر دیا جائے اور جس طرح بھی ممکن ہو سکے مغربی تہذیب وثقافت کو اسلامی تہذیب میں اس طرح ضم کر دیا جائے کہ دونوں حقیقتیں بظاہر ایک معلوم ہوں۔ مادیت اور روحانیت کا یہ قدیم جھگڑا آج پورے شباب پر ہے۔ مادیت کے تباہ کن سیلاب میں دینی اقدار وروایات کو اس طرح پامال ہوتے دیکھ کر اسلامی قدروں کی بقا واستحکام اور عالمی سطح پر ان کا فروغ ایک ناممکن امر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس زمینی سچائی کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ آج دنیا کی ۷۵ رفی صد آبادی مادیت کی پرستار ہونے کے باوجود روحانیت کی قائل ہے اور صرف قائل ہی نہیں، بلکہ منبع روحانیت کی تلاش میں سرگرداں بھی ہے۔

قلبی سکون اور روحانی آسودگی کے لیے آج لوگ اپنے طور پر مختلف عبادت گاہوں اور آشرموں کا طواف کرتے نظر آتے ہیں، مگر روحانی سکون اور قلبی آسودگی انھیں میسر نہیں۔ دل کی دنیا میں جو اضطراب پہلے تھا وہ اب بھی باقی ہے۔ آخر کیوں؟ میں سمجھتا ہوں اس کی بنیادی وجہ منزلِ مقصود تک رسائی کے لیے راستے کا غلط تعین ہے۔

ع: کیں رہ کہ تو روی بہ ترکستان است

جب فکر وعمل کا قبلہ بگڑ جاتا ہے تو بالعموم یہی صورت حال پیش آتی ہے۔ ایسے مایوس کن ماحول میں زخمِ انسانیت پر روحانی تسکین اور قلبی سکون کا مرہم اگر کوئی رکھ سکتا ہے تو وہ اسلام اور اس کا «نظامِ تصوف» ہے۔ تصوف اور صوفیۂ کرام کی تاریخ بتاتی ہے کہ انھوں نے ہر دور میں سسکتی ہوئی انسانیت کے دکھ درد کا مداوا کر کے روحانی قدروں کو فروغ بخشا ہے۔

شریعت اور طریقت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ طریقت یا تصوف ایک مقدس اور بابرکت فن ہے۔ شریعت جن احکام کی ترغیب دیتی ہے۔ طریقت ہمیں ان احکام کو زندگی کے عملی سانچے میں ڈھالنے پر ابھارتی ہے، گویا تصوف اور خانقاہ اسلام کی حیات بخش تعلیمات کی «عملی تربیت گاہ» کا نام ہے، اسے ہندوؤں کی جوگیت، ایرانیوں کی مزوکیت، بدھوں کی گوشہ نشینی اور عیسائیت کی رہبانیت سے تعبیر کرنا سراسر غلط اور روحِ تصوف سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

مبادیاتِ طریقت اور مسائل تصوف پر متعدد زبانوں میں اب تک ہزاروں کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب «ایضاحِ حقیقت» اسی سلسلۃ الذہب کی ایک اہم اور مضبوط کڑی ہے۔ یہ کتاب دراصل «شرح حقیقت محمدیہ» فارسی کا اردو ترجمہ ہے۔ اس فارسی رسالے کے مصنف حضرت شیخ عبدالعزیز خالدی (متوفی: ۱۰۳۰ھ) ہیں، جو علامہ سید وجیہ الدین گجراتی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ اصل متن عربی زبان میں «حقیقتِ محمدیہ» کے نام سے موسوم ہے، جس کے مصنف دسویں صدی ہجری کی مایہ ناز علمی وروحانی شخصیت حضرت علامہ سید وجیہ الدین گجراتی (متوفی: ۹۹۸ھ) ہیں۔ آپ علومِ عقلیہ ونقلیہ کے ماہر اور کثیر التصانیف بزرگ ہیں۔ «مآثر الکرام» کے مصنف حضرت غلام علی آزاد بلگرامی نے آپ کی چھوٹی بڑی تصنیفات، شروحات وحواشی کی تعداد ۱۹۷ر بتائی ہے۔ اصولِ حدیث میں علامہ ابن حجر عسقلانی شافعی کی «شرح نخبۃ الفکر» کی آپ نے مبسوط شرح لکھی ہے۔ یہ کتاب مجلس برکات مبارک پور سے «نزھۃ النظر» کے ساتھ شائع ہوچکی ہے۔

حصۂ متن (حقیقتِ محمدیہ) ایک مقدمہ، دو مطلب اور ایک تکملہ پر مشتمل ہے۔ مقدمہ میں تصوف کی تعریف، موضوع، مبادیاتِ تصوف اور اس کے مختلف مسائل کا ذکر ہے۔ مطلبِ اول میں وجودِ حق باری تعالیٰ کے ظہور کی کیفیت، حقیقت محمدیہ کیا ہے؟ اور ظہورِ عالم کیسے ہوا؟ ان امور پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ مطلبِ دوم میں مطلبِ اول کے مندرجات پر صوفیہ ومتکلمین کے مذاہب وآرا اور ان کے مابین تطبیق پر بحث کی گئی ہے۔ جب کہ «تکملہ» میں انبیاے کرام علیہم الصلوٰۃ والتسلیم، اولیاے عظام اور مراتبِ اولیا پر محققانہ اسلوب میں کلام کیا گیا ہے۔

شارحِ کتاب حضرت شیخ عبدالعزیز خالدی رحمۃ اللہ علیہ نے متن کے مذکورہ مباحث کی جو عالمانہ توضیح وتشریح فرمائی ہے، اسے پڑھ کر بے ساختہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ حضرت شیخ خالدی نے واقعی شرح لکھنے کا حق ادا کر دیا ہے۔ کتاب کی اہمیت ومعنویت کا بخوبی اندازہ تو مطالعے کے بعد ہی لگایا جاسکتا ہے، لیکن جہاں تک اس کے مضامین کی وسعت اور ہمہ گیری کی بات ہے تو اس کے لیے کتاب کی فہرست پر ایک سرسری نگاہ ڈال لینا ہی کافی ہے۔ فاضل مصنف نے تقریباً ۲۳۵ ر ذیلی عنوانات کے تحت تصوف، اس کے متعلقات اور دیگر اہم مباحث پر علم وتحقیق کے جوہر لٹائے ہیں۔

کتاب کا اسلوب اور طرزِ استدلال خالص فلسفیانہ ہے۔ مسائل کی تفہیم میں متکلمانہ رنگ غالب ہے۔ اس کے بعض علمی مباحث کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ تصوف کی نہیں بلکہ فلسفہ اور علمِ کلام کی کوئی مغلق اور پیچیدہ بحث ہے۔

مندرجہ ذیل امور کتاب کے اہم اور خاص مباحث ہیں۔

تصوف کی حقیقت وماہیت، مسائلِ تصوف، اربابِ طریقت کے ظاہری وباطنی اخلاق واوصاف، ابدال، اخیار اور اقطاب کی جامع صفات، وجودِ حق باری تعالیٰ کے ظہور کی کیفیت، حقیقتِ محمدیہ، عناصرِ اربعہ کے مزاج اور کیفیت، نبوت کی قسمیں، ولایت کے درجات واولیاے کرام کی انواع واقسام، عبادت کی قسمیں، فرائض کی اہمیت، نوافل کا مقام، آثارِ محبت، عبادت کی قسمیں، فضائل تقویٰ، تسلیم، تفویض اور رضا بالقدر کی حقیقت وغیرہ۔

غرض کہ اس قسم کے بے شمار علمی افادات ہیں، جنھیں آپ اس کتاب میں دیکھ سکتے ہیں۔ اصلاحِ امت سے متعلق کتاب کا یہ اقتباس بار بار پڑھنے کے لائق ہے۔

«اربابِ تصوف کے اخلاق یہ ہیں: حلم وبردباری، تواضع ونصیحت، باربرداری وشفقت، بشاشت وخندہ روئی، الفت وموافقت، جاں ومال صرف کرنا، عفو ودرگزر، وعدہ وفائی، سارے مخلوق پر حسنِ ظن، اپنے نفس کو حقیر جاننا، اپنے دینی بھائیوں کی عزت کرنا، ہر چھوٹے بڑے کے ساتھ رحم ومروت کا برتاؤ، ظالم پر دعا، اور اسی طرح کے دوسرے اخلاق وشمائل سے متصف رہنا...... جاننا چاہیے کہ یہ ان کے ظاہری اوصاف ہیں، اور ان کی باطنی حقیقی صفتیں یہ ہیں: باطن کو حق کے ماسوا سے خالی کر لینا اور قلب کو اغیارِ مطلق کے غبار سے صاف رکھنا۔»

(ایضاحِ حقیقت، ص: ۴۹)

یقیناً ان اوصاف وکردار کو آج عام مسلمان بالعموم اور اربابِ خانقاہ بالخصوص حرزِ جاں بنالیں تو ہمیں دنیا وعقبیٰ میں کامیابی وسرخ روئی حاصل ہوسکتی ہے اور خانقاہوں کی عظمتِ رفتہ کی بازیافت ممکن ہوسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حسنِ عمل کی توفیق دے۔

کتاب مجموعی حیثیت سے قابلِ مطالعہ اور لائقِ استفادہ ہونے کے ساتھ تاریخ تصوف میں ایک گراں قدر باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ عمدۃ المحققین حضرت علامہ محمد احمد مصباحی دامت برکاتہم القدسیہ کی اصلاح ونظر ثانی نے کتاب کی معنویت میں چار چاند لگا کر اسے سندِ اعتبار فراہم کر دی ہے۔ اللہ تعالیٰ جماعتِ اہل سنت پر حضرت کا سایہ تا دیر قائم رکھے۔ قابلِ مبارک باد ہیں حضرت مولانا نصر اللہ رضوی مصباحی، جنھوں نے کتاب کا سلیس اردو زبان میں ترجمہ کر کے قارئین کے لیے آسانیاں فراہم کیں اور انھیں تصوف کے اس گنجِ گراں مایہ سے خاطر خواہ استفادہ کرنے کا موقع عنایت فرمایا۔

زیر تبصرہ یہ کتاب، «شرح حقیقت محمدیہ» فارسی کا اردو ترجمہ ہے، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، سرورق ٹائٹل پر بھی یہی لکھا ہے۔ لیکن پوری کتاب میں اندرونی صفحات کے اوپری حصے پر «ایضاحِ حقیقت ترجمۂ حقیقتِ محمدیہ» دیکھ کر حیرت اور تعجب ہوا اور ناچیز اس معمہ کو سمجھنے سے قاصر رہا۔ غالباً تسامح سے ایسا ہو گیا ہے، جب کہ «ترجمۂ شرح حقیقتِ محمدیہ» ہی ہونا چاہیے۔

☆☆☆

خیابانِ حرم

منظومات

نعتِ رسولِ اکرم ﷺ

شگفتہ کاش مرے دل کی بھی کلی ہو جائے
درِ رسول پہ میری بھی حاضری ہو جائے
جہنم اس کے لیے کیوں نہ دائمی ہو جائے
جسے رسول کے یاروں سے دشمنی ہو جائے
جسے بھی دعویٰ ہے اللہ کی محبت کا
تو اس کو چاہیے وہ تابعِ نبی ہو جائے
یہ شان صرف خدا وند ذو الجلال کی ہے
کہ کائنات میں جو چاہے بس وہی ہو جائے
الٰہی کلمۂ طیب ہو لب پہ اور درود
مری حیات کا جب وقت آخری ہو جائے
عمل ہو اپنا اگر اسوۂ نبی پہ ضیاؔ
تو پھر یہ زندگی سچ مچ کی زندگی ہو جائے

ضیا یزدانی بلرام پوری

نعتِ رسولِ اکرم ﷺ

کوے محبوب سے آیا ہے بلاوا میرا
دل کسی طور یہاں اب نہیں لگتا میرا
کھل گیا اے مرے اللہ نصیبہ میرا
بن گیا دردِ محبت ہی مداوا میرا
دوریِ منزلِ الفت کا نہیں غم مجھ کو
سن لیا ہے شہِ خوباں نے سندیسہ میرا
چھوڑ دوا ے مرے احباب کہ اب وقت نہیں
رحمتیں دیکھتی ہیں دیر سے رستہ میرا
اپنی قسمت پہ کروں ناز میں جتنا، کم ہے
لطف فرما ہے مرے حال پہ آقا میرا
نہ زر و مال نہ اعمال پیامیؔ میرے
ان کی الفت ہے فقط ایک وسیلہ میرا

مہتاب پیامی

منقبت درشان حضور سرکار مجی علیہ الرحمۃ والرضوان، پوکھریرا شریف، سیتامڑھی---از: ڈاکٹر وصی مکرانی واجدی

زیارت کے لیے جب تیرے گھر زوار آتے ہیں ------- عقیدت میں نہ جانے اپنا کیا کیا وار آتے ہیں
یہ سرکارِ مجی کی عقیدت کا ثمر ہے جو ------- محبت سے بریلی کے یہاں سرکار آتے ہیں
یہ پوکھریرا جو فکر وفن کی فطرت کا ہے **گہوارہ** ------- کہ اس بستی کے ہر گھر میں نظرفن کار آتے ہیں
ہے اس کی خاک کے ذرات میں زورِ **مسیحائی** ------- شفا پاتے ہیں، جب کوئی یہاں بیمار آتے ہیں
میں اپنے دل کے گلشن میں محبت سے سجا لوں گا ------- مرے حصے میں گر کوئی یہاں کے خار آتے ہیں
بریلی سے تم اس شہرِ عقیدت کا پتہ پوچھو ------- "یہاں آنکھوں سے چل کر طالبِ دیدار آتے ہیں"
لکھی ہے منقبت کیسی وصیؔ شانِ مجی میں ------- یہاں سب کی زباں پر بس ترے اشعار آتے ہیں

صدائے بازگشت

یہ کالم ایک "صلاے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے" اس کے تحت علمی، فکری، تنقیدی اور تجزیاتی مراسلات کو ترجیح دی جائے گی

ماہ نامہ اشرفیہ نے ہر موڑ پر قوم کی رہ نمائی کی ہے

مکرمی جناب مدیر اعلیٰ صاحب...........سلام مسنون

اکتوبر ۲۰۱۰ء کا شمارہ موصول ہوا، "دیر آید درست آید" اس شمارے پر بجا طور پر صادق آتا ہے۔ تمام مضامین معلومات افزا اور قابلِ مطالعہ ہیں۔ ٹائٹل پر حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کی تحریر کا اقتباس اربابِ حکومت کے لیے نمونۂ درس ہے۔

ادارتی صفحات پر حضرت مفتی محمد نظام الدین رضوی صاحب اور مولانا یٰسین اختر مصباحی صاحب نے جن امور کی نشان دہی فرمائی ہے، انھیں عملی جامہ پہنانے کی ضرورت ہے۔ خانقاہ برکاتیہ مارہرہ شریف کی فکر وتدبیر کانفرنس دیگر خانقاہوں کے لیے نمونۂ تقلید ہے۔ آج بالعموم یہ دیکھا جاتا ہے کہ مختلف خانقاہوں میں عرس کے ایام میں صرف زائرین کی بھیڑ جمع ہوتی ہے، اربابِ خانقاہ زائرین سے صرف نذرانے وصول کرنے کی فکر میں رہتے ہیں اور اسلام وسنیت کے حوالے سے انھیں کبھی کوئی "فکر وتدبیر کانفرنس" کرنے کی توفیق نہیں ہوتی۔

"اوقاف ومساجد کی زمین کا شرعی حکم" ایک اہم مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔ حالات کے تناظر میں اس قسم کے مضامین کی اشاعت آپ کی صحافیانہ بصیرت کی آئینہ دار ہے۔ بابری مسجد کے تعلق سے آج مختلف نظریات پائے جاتے ہیں۔ بعض غیر ذمہ دار اور شرعی احکام سے ناواقف حضرات تو یہاں تک کہہ رہے ہیں کہ "ملکی امن وامان کے قیام اور معاشرتی رواداری کے فروغ کے لیے بابری مسجد، ہندوؤں کے حوالے کر دی جائے اور ان سے مسجد کی قیمت وصول کر لی جائے۔"

اس قسم کے خیالات پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ اسی طرح بابری مسجد ملکیت مقدمہ کے حالیہ فیصلے کے بعد طرح طرح کی قیاس آرائیاں اور نت نئے بیانات سامنے آرہے ہیں۔ اس قسم کا یہ انفرادی بیان بھی مناسب نہیں۔ پوری قوم کی تقدیر کا فیصلہ کرنے والے آخر یہ لوگ کون ہوتے ہیں؟

"بزمِ دانش" کے کالم میں "ملحق مدارس میں رشوت کی گرم بازاری علاج کیا ے تحت مولانا ساجد رضا مصباحی، مولانا نور الہدیٰ مصباحی اور عابد چشتی کے تاثرات اور آرا بہت قیمتی ہیں۔ مسلم معاشرے میں دیگر برائیوں کی طرح "رشوت کی برائی" بھی دن بہ دن زور پکڑتی جا رہی ہے اور معاشرے کو دیمک کی طرح چاٹتی جا رہی ہے۔ اگر عام لوگ اس بیماری میں مبتلا ہوتے تو کوئی زیادہ حیرت کی بات نہ تھی، مگر افسوس تو اس بات کا ہے کہ آج مدارس دینیہ کے اندر یہ بیماری پنپ رہی ہے۔ واقعی ہم اسے قیامت کی نشانی ہی کہہ سکتے ہیں۔ مولانا عابد چشتی سے ہمیں اس بات پر اتفاق ہے کہ "جن مدارس میں رشوت کا بازار گرم ہے، ان کا سماجی بائیکاٹ کیا جائے" عوام ہی بہتر طور سے اس مرض کا علاج کر سکتے ہیں۔

یقیناً ماہ نامہ اشرفیہ نے ہر موڑ پر قوم کی بروقت رہ نمائی کی ہے اور اسے حقیقت کا آئینہ دکھایا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے مزید ترقی عطا فرمائے اور حاسدوں کی نظر بد سے بچائے۔ فقط رحمت اللہ مصباحی

مولانا غلام زرقانی کی تنقید پر تنقید

مکرمی جناب مدیر اعلیٰ صاحب...........تسلیماتِ وافرہ

وہابی اللہ عز وجل ورسول اللہ ﷺ کے گستاخ کو کہتے ہیں اور جو ان کی گستاخی کی دیدہ ودانستہ تائید وتوثیق کرے وہ بھی وہابی، کافر، مرتد، گستاخ ہے، لیکن ان کی بے تکی وناجائز گرفت وتنقید بھی اللہ ورسول کی نافرمانی ہے۔ اور قرآن وحدیث میں من مانی ہانکنا بھی بدترین گم راہی وگمراہ گری سے کم نہیں ہے۔

بڑا تعجب ہے مولانا مبارک حسین مصباحی مدیر ماہ نامہ اشرفیہ پر کہ مولانا غلام زرقانی کا بے تکا مضمون کیسے شائع فرما دیا کہ ناچیز ماہ نامۂ مذکورہ کا جولائی ۲۰۱۰ء سے الجامعۃ الاشرفیہ میں خود پہنچ کر پہلا خریدار بنا اور جبل پور واپس آنے کے کچھ دنوں بعد پہلے شمارے کی زیارت سے مشرف ہوا۔ تو اس کے ص: ۹-۶ میں [غثاءً احویٰ کی تفسیر اور کنز الایمان کا تفوق] نظر نواز ہوا، جس کے قلم کار مولانا غلام زرقانی صاحب ہیں۔ مذکورہ ص: ۹ر میں شاہ رفیع الدین دہلوی تا ابو الاعلیٰ مودودی کے تراجم نقل کر کے لکھتے ہیں:

«مندرجہ بالا تراجم پر نگاہ ڈالیں، ان کے مترجمین نے احویٰ کا ترجمہ « کوڑا کرکٹ» کیا ہے، یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ کوڑا کرکٹ ہماری تہذیب میں کسی اچھی چیز کو نہیں کہتے، بلکہ روزمرہ کی زبان میں نہایت گھٹیا چیز کو کوڑا کرکٹ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اب ذرا سیاق وسباق پر غور فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ یہ فرما رہا ہے کہ «اس نے زمین سے سبز چارا نکالا اور اُسے سکھا کر سیاہ کر دیا جو حیوانات کی عمدہ غذا کہلائی۔» الخ

ناچیز امتیاز القادری عفی عنہ کی سمجھ سے بالا ہے۔

کیوں کہ سبز چارہ کو تو حیوانات کی عمدہ غذا کہا جانا عقل وخرد کے عین مطابق ہے لیکن اسے سکھا کر سیاہ کر دینے کے بعد حیوانات کی عمدہ غذا کہنا موافق نص قرآنی ہرگز نہیں ہے۔

تو پھر یہ لکھنا کہ [اللہ تعالیٰ یہ فرما رہا ہے کہ اس نے زمین سے سبز چارہ نکالا اور اسے سکھا کر سیاہ کر دیا جو حیوانات کی عمدہ غذا کہلائی] کیسے اور کیوں کر درست ہو سکتا ہے؟

اللہ اکبر! [کوڑا کرکٹ] کے لفظ پر مولانا صاحب اس قدر برہم ہوئے کہ اپنی خوش فہمی کو اللہ تعالیٰ کا مقصود قرار دے بیٹھے اور سیاق وسباق پر گور وفکر کی دعوت دکر خود اس سے کوسوں دور رہے کہ عنوان [لغات کے حوالے سے] کے تحت ص:۶ ر میں لسان العرب کی عربی کا ترجمہ لکھتے ہیں:

«جب نباتات سوکھ کر خشک ہو جائیں تو اُسے غُثاء کہتے ہیں اور احوٰی اس چیز کو کہتے ہیں جو بوسیدگی وقدامت کی وجہ سے سیاہ ہو جائے۔»

اور اس پر ذرا بھی توجہ نہیں دیتے ہیں کہ نباتات جب بوسیدہ اور پرانی ہونے کی وجہ سے سیاہ ہو جاتی ہیں تو کوڑا کرکٹ اور بے کار شے ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اور ص:۷ ر میں امام راغب اصفہانی علیہ الرحمہ کی عبارت «الغثاء السیل والقدر یضرب به المثل فیما یضیع و یذهب غیر معتد به» لکھ کر اس کا مطلب نہیں سمجھ پائے، جب کہ اس کا مطلب یہی ہے کہ غُثَاءٌ کا معنی ومطلب ہی کوڑا کرکٹ اور نہایت گھٹیا چیز ہے جس کی کوئی قدر وقیمت نہیں ہوتی، اسی لیے ایسی گھٹیا چیزوں کو ضرب المثل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ پس [کوڑا کرکٹ] کے لفظ پر آپے سے باہر ہونا کوئی معنیٰ نہیں رکھتا۔

پھر مولانا غلام زرقانی صاحب کا مزید کمال یہ ہے کہ لسان العرب کی بقیہ عبارت کا ترجمہ یوں لکھتے ہیں:

«اس کے معنیٰ یہ بھی بیان کیے گئے ہیں کہ اَخرَجَ المَرعیٰ اَحوٰی یعنی اسے سبز اگایا اور پھر خشک کر دیا، اور اس طرح دونوں جملوں میں تاخیر وتقدیم ہو گئی ہے اور احوٰی کے معنی زیادہ سرسبز و شاداب ہو جانے کی وجہ سے سیاہ ہونے کے بھی ہیں جیسے قرآن میں مُدهَامَّتَان یعنی دو سبز سیاہی مائل باغ آیا ہے۔»

اور غور نہیں فرماتے ہیں کہ اس میں امیر احسن اصلاحی اور جاوید احمد غامدی کی پرزور تائید ہوتی ہے اور خود اپنی مٹی پلید۔

اسی طرح غلام زرقانی صاحب، امام زجاج و ابن قتیبہ اور زمخشری کی عبارات کا حوالہ دے کر ترجمہ کر کے اُن کی اصل مراد تک نہ پہنچ پائے کہ ان کی [غُثَاء] سے اصل مراد وہی ہے جس کو ہماری تہذیب میں کسی اچھی چیز کو نہیں کہتے بلکہ روزمرہ کی زبان میں نہایت ہی گھٹیا چیز کو کوڑا کرکٹ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

جب کہ تفسیرِ طبری کی عبارت دے کر اُس کا ترجمہ جو فرمایا ہے، وہ بھی غُثَاء کا معنیٰ کوڑا کرکٹ، گھٹیا بے قدر وقیمت چیز ہی متعین کر رہا ہے۔ مزید یہ کہ امام قرطبی علیہ الرحمہ کی عبارت دے کر اپنی ہی ناک کاٹ ڈالی ہے کہ وہ بھی وہی لکھ گئے ہیں جو تمام مفسرین نے لکھا ہے، ملاحظہ ہو، اُن کی عبارت کا ترجمہ غلام زرقانی صاحب نے خود یوں لکھا ہے:

«غُثَاء سے مراد، وہ گھاس پھوس اور کوڑا کرکٹ ہے جسے سیلاب وادیوں کے کناروں پر پھینک دیتا ہے اور جب سبزہ اور گھاس، ریزہ ریزہ اور خشک ہو جائے تو اسے غُثَاء یا هشیم کہتے ہیں۔»

پھر کمال یہ ہے کہ امام قرطبی کی عبارت کے آخری جملے میں «غُثَاء وهشیم» کا ترجمہ «غُثَاء یا هشیم» لکھا ہے، جب کہ اس کا اردو ترجمہ «غُثَاء هشیم» ہے۔

یعنی «و» کا ترجمہ «یا» کے لفظ سے کیا ہے۔ شاید اس میں بھی مولانا صاحب کی کوئی فن کاری ہے، اور مزید کمال یہ کیا ہے کہ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے قول میں «فجعله اسود من احتراقه و قدمه» کا ترجمہ لکھتے ہیں «اسے بوسیدہ ہونے یا جل کر راکھ ہونے کی وجہ سے سیاہ کوڑا کر دیا» اور غور نہیں فرماتے کہ جب گھاس جل کر راکھ ہو گئی تو حیوانات کی عمدہ غذا کب رہ گئی؟ اور یہاں بھی زرقانی صاحب نے اپنی فن کاری دکھائی ہے کہ عبارت بالا میں «و» ہے جس کا ترجمہ «یا» فرمایا ہے۔ اور احتراق کا ترجمہ «جل کر راکھ ہونا» لکھا ہے۔

اب اس جلنے سے مراد آگ سے جل کر راکھ ہونا ہے یا تمازتِ آفتاب سے یا کوکبِ دماغ سے؟ اسے مولانا ہی بتا سکتے ہیں۔

اور اس ترجمہ میں «سیاہ کوڑا کرکٹ کر دیا» خود لکھ رہے ہیں اور اس کے باوجود اس پہ چیں بہ جبیں ہو رہے ہیں۔

اسی طرح حضرت عبدالرحمٰن ابن زید کی عبارت «اخرج المرعیٰ اخضر ثم لما یبس اسود من احتراقه فصار غثاءً تذهب به الریح والسیول» کا ترجمہ یوں لکھتے ہیں:

«اللہ تعالیٰ نے سبز نباتات اگائی پھر جب وہ خشک ہوئی اور سیاہ راکھ بن گئی تو وہ غثاء ہے، جسے ہوائیں اڑاتی پھرتی ہیں اور سیلاب بہالے جاتے ہیں۔»

اس پر بھی یہی عرض ہے کہ جب سبز نباتات خشک ہوئی اور سیاہ راکھ بن گئی جسے ہوائیں اڑاتی پھرتی ہیں اور سیلاب بہالے جاتے ہیں تو وہ حیوانات کی عمدہ غذا، کب پائی اور بنائی گئی اور وہ سیاہ کوڑا کرکٹ نہ ہوئی تو پھر کیا ہوئی، اور کہلائی؟ اور اس پر طرفہ تماشہ یہ ہے کہ حضور قبلہ عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی عبارت لکھ کر اس کا ترجمہ یوں فرماتے ہیں:

«غثاءً احوٰی، یعنی سیاہ ہو گئی، کیوں کہ خشک نباتات جب بوسیدہ ہو جاتی ہے تو بارش وغیرہ کے اثر سے گل سڑ کر سیاہ ہو جاتی ہے۔»

اب مولانا غلام زرقانی صاحب سے کوئی عرض کرے کہ حضرت! جب وہ تر وتازہ گھاس بوسیدہ یعنی پرانی ہو جاتی ہے اور بارش وغیرہ کے اثر سے سڑ گل کر سیاہ وخراب اور برباد ہو جاتی ہے تو حیوانات کی عمدہ غذا کب بن جاتی ہے، پھر یہ کہ تر وتازہ گھاس پر کچھ پانی پڑنا اس کی حیات کی بقا کا سبب ہوتا ہے نہ کہ بربادی وہلاکت کا؟

ہاں! خشک ہو جانے کے بعد پانی یا تری وغیرہ پہنچنے پر اُس کا سڑنا، گلنا، خراب وبرباد ہونا خود مولانا صاحب کو قبول ہے تو یہ بھی قبول ہوگا کہ اُس کے لیے وقت درکار ہوتا ہے، جس کا صاف وصریح مطلب یہی ہے کہ «فجعله» میں «ف» تاخیر کا ہے نہ کہ تعجیل کا اور حضور قبلہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی وہی کہہ رہے ہیں کہ تر وتازہ گھاس و نباتات، حیوانات کی عمدہ غذا ہے اور جب کچھ دنوں کے بعد اس کی تر و تازگی ختم ہو جاتی ہے اور وہ پانی وغیرہ کے اثر سے سڑ گل کر بے کار و بے قدر اور بے قیمت ہو جاتی ہے تو اس کی اوقات کورا کرکٹ، گھٹیا اور بے وزن و بے مقدار چیز کی سی ہو کر رہ جاتی ہے اور کوڑا کرکٹ سے موسوم قرار پاتی جاتی ہے اور «غثاءً احوٰی» سے اللہ تعالیٰ کی یہی مراد ہے جیسا کہ حضرت عبدالرحمٰن ابن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔

«و هو مثل ضرب الله تعالیٰ للکفار لذهاب الدنیا بعد نضارتها» یعنی فرمانِ الٰہی «اخرج المرعیٰ فجعله غثاءً احوٰی» کافرین کے لیے ایک مثل ہے کہ دنیا کی شادابی وتر وتازگی اور اس کے حسن ونکھار کو ایک دن تباہی وبربادی میں بدل دیا جائے گا۔ جس طرح تر وتازہ گھاس ونبات کو کچھ دنوں کے بعد خشک وسیاہ کر کے بے کار وبرباد کر دیا جاتا ہے، تو عبرت پکڑو، عبرت پکڑنے والو۔

اور امام احمد رضا علیہ الرحمۃ والرضوان کے ترجمہ «اور جس نے چارہ نکالا پھر اسے خشک سیاہ کر دیا» سے بھی یہی حقیقت سمجھ میں آتی ہے کہ چارہ کو خشک وسیاہ کرنے کے بعد اسے کوڑا کرکٹ میں بدل دیا جانا ہی مراد ہے۔ تو سارے مترجمین کے تراجم تقریباً متحد المعنیٰ والمطلب ہوئے۔

ہاں! اصلاحی وغامدی کا ترجمہ وترجمانی جمہور کی روش سے ہٹ کر شذوذ کی طرف مائل ہے لیکن یہ ایسا شذوذ نہیں کہ استحقاقِ نارِ جہنم کا باعث قرار دیا جا سکے۔ یہ اور بات ہے کہ جو وہابی ہے اور اُسی وہابیت اور ارتداد پر مر جائے وہ کلابِ اہلِ نار سے ہے۔ اور امام احمد رضا علیہ الرحمہ کا تفوقِ علم و ولایت کا مقر ومعترف نہ ہونا کسی جاہل یا حاسد یا تنگ نظر متعصب حرماں نصیب ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ اور آپ کی عبقریت کا اقرار، اپنے تو اپنے بے شمار بے گانے بھی کرتے چلے آتے ہیں، پھر کوئی ضرورت نہیں ہے کہ مولانا غلام زرقانی کی طرح حقائق ناشناسی کے باوجود قلم کاری کر کے آپ کا تفوق کسی بھی معاملہ میں تقابلی جائزہ لے کر بغلی بجائی جائے اور شائع کرا کر داد وتحسین چاہی جائے کہ ایسی قلم کاری سے اپنے ممدوح کی طرف انگشت نمائی کا موقع فراہم ہوتا ہے اور لائقِ ملامت قرار پاتا ہے۔

یہاں تک بات اپنے پایۂ کمال تک پہنچ چکی تھی کہ توجہ کا ایک نور اور چمک اٹھا کہ مولانا غلام زرقانی صاحب نے [قرآن کریم کے دیگر اردو تراجم] کے عنوان کے تحت جن مترجمین کے تراجم نقل کیے ہیں ان میں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر علیہما الرحمۃ والرضوان تو اپنے آقاؤں میں سے ہیں۔

اول الذکر کے ترجمہ میں «فجعله» کے «ف» کا ترجمہ «پس» ہے اور ثانی الذکر کے ترجمہ میں «ف» کا ترجمہ «پھر» ہے اور جالندھری اور وحید الزماں اور تھانوی اور دریابادی اور مودودی نے اِس «ف» کا ترجمہ «پھر» کے لفظ سے کیا ہے۔ یعنی شاہ رفیع الدین سے لے کر مودودی تک سب نے «ف» کو تاخیر کا ہی مانا ہے اور وہ بالیقین تاخیر کا ہی ہے۔

اور حق یہ ہے کہ امام احمد رضا علیہ الرحمہ نے بھی اِسے تاخیر ہی کا مانا اور ترجمہ کیا ہے۔ جیسا کہ امام موصوف کا ترجمہ ناچیز نے اوپر جو نقل کیا ہے اس میں بھی «پھر» کا لفظ موجود ہے، مگر مولانا غلام زرقانی صاحب نے امام موصوف کی طرف منسوب کر کے جو ترجمہ لکھا ہے اس میں «پھر» کی بجائے «اور» کا لفظ ہے، اب اسے مولانا کی کارستانی کہی جائے یا کاتب کی شرارت یا امامِ موصوف کا تسامح یا مولانا مبارک حسین مدیر ماہنامہ اشرفیہ کی ذمہ دارانہ اداؤں کا جلوہ؟

لہٰذا اب دیکھنا یہ ہے کہ مدیر موصوف جو اپنی دانست میں ترجمانیِ اہل سنت کا حق ادا فرما رہے ہیں، ہمارے اس تبصرے کو اپنے ماہنامہ میں من وعن شائع فرما کر ترجمانی اہل سنت کا ایک حق اور ادا کر کے ثواب دارین حاصل فرماتے ہیں یا نہیں؟ فقط والسلام

امتیاز القادری، جبل پور

تنظیمی سرگرمیاں

آر ایس ایس ملک کی سالمیت کے لیے عظیم خطرہ

خفیہ ایجنسیوں کی تحقیقات سے ہمارے ملک میں دہشت گردوں کا چہرہ بے نقاب ہوتا جارہا ہے۔ اور انہیں تحقیقات کی روشنی میں کانگریس نے آر ایس ایس اور اس سے منسلک تنظیموں کو آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے ان پر دہشت گردی میں ملوث ہونے کا الزام لگایا اور کہا کہ الہ آباد ہائی کورٹ کا حالیہ فیصلہ بابری مسجد مسمار کرنے والوں کو معاف نہیں کرتا۔ تنظیم ابنائے اشرفیہ مبارک پور کے ذمہ داروں نے اپنے بیان میں کہا کہ آر ایس ایس ملک کی سالمیت اور امن و امان کے لیے ایک عظیم خطرہ ہے۔ ملکی امن وامان اور بقا و استحکام کے لیے آر ایس ایس اور اس کی ذیلی تنظیموں پر حکومت پابندی عائد کر کے دہشت گردی پر بڑی حد تک قابو پاسکتی ہے۔ مفکر اسلام مولانا مبارک حسین مصباحی (جنرل سکریٹری تنظیم ابنائے اشرفیہ مبارک پور) نے فرمایا کہ اس الزام کے بعد مرکزی حکومت کے لیے ضروری ہے کہ وہ آر ایس ایس اور اس کی ذیلی تنظیموں کے خلاف فوراً قانونی کارروائی کرے۔ ملک کی تعمیر وترقی کے لیے ان ملک دشمن طاقتوں پر پابندی عائد کی جائے۔ دہشت گردی ملک کی سالمیت کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے اس کے خاتمہ کے لیے سب کو مل جل کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ نے حکومت سے سوال کیا کہ بابری مسجد انہدام کے مجرمین پر کارروائی سے کون سی چیز مانع ہے؟ اگر حکومت کی نیت صاف ہے تو جلد وہ اس سمت میں پیش رفت کرے۔ اور ان اہم ایشوز کو سیاسی مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ نہ بنائے۔ اس نشست میں مندرجہ ذیل افراد نے شرکت کی مولانا نعیم الدین عزیزی مصباحی، مولانا حبیب اختر مصباحی، مولانا زاہد علی سلامی، مفتی بدر عالم مصباحی، مولانا قطب الدین مصباحی، مولانا طفیل احمد مصباحی، مولانا اسلم مصباحی، جناب مہتاب پیامی صاحب وغیرہ۔

از: محمد رحمت اللہ مصباحی آفس انچارج تنظیم ابنائے اشرفیہ

جامعہ اشرفیہ میں تنظیم فکر و اصلاح کا سالانہ اجلاس

مورخہ ۹؍ اکتوبر ۲۰۱۰ء الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور میں تنظیم فکر و اصلاح کی جانب سے سالانہ انعامی اجلاس منعقد ہوا، جس میں تلاوت قرآن اور نعت رسول ﷺ کے بعد فخر صحافت خطیب ہند مولانا مبارک حسین مصباحی جنرل سکریٹری تنظیم ابنائے اشرفیہ مبارک پور نے قرآن عظیم فرقان حمید کی اہمیت وحقانیت پر علمی وتحقیقی روشنی ڈالی اور تحریر وتقریر کے اہم نکات کی طرف توجہ دلائی۔ اس کے بعد مقالہ نگار اور جداریوں کے ایڈیٹر حضرات کو اعزازی اور ترغیبی انعامات سے نوازا گیا اور صدر تنظیم مولانا امتیاز احمد، مہراج گنج نے تمام ممبران اور شرکا حضرات کا شکریہ ادا کیا۔

اخیر میں بانی تنظیم وسابق صدر مولانا محمد غلام مجتبیٰ کلکتہ نے تنظیم کے مختلف شعبہ جات کا شمار کراتے ہوئے "فکر و اصلاح، البلاغ، Argument، کرانتی، المسابقۃ الکتابیہ، النادی العزیز، Azizi Gathering اور الرسالۃ الاسلامیہ کا ایک مختصر خاکہ پیش کیا اور تمام طلبہ اشرفیہ اور مصباحی برادران سے اخلاقی معیار پر مزید توجہ دینے کی پر خلوص اپیل کی۔ اس طرح صلوٰۃ وسلام اور دعا پر پروگرام کا اختتام ہوا۔

از: محمد غلام مجتبیٰ، جامعہ اشرفیہ مبارک پور

عالمی خبریں

امریکہ میں ۱۸۰؍ افراد کا قبول اسلام

امریکہ کی ریاست فلوریڈا کے ایک عیسائی پادری کی جانب سے قرآن پاک کی بے حرمتی کی دھمکی کے بعد غیر مسلم شہریوں کے اسلام کی جانب رجحان میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے اور اب تک ۱۸۰؍ امریکیوں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ عرب ٹی وی کی ایک رپورٹ کے مطابق امریکی دار الحکومت واشنگٹن کے اسلام سینٹر کے ڈائریکٹر محمد ناصر نے بتایا ہے کہ ریاست فلوریڈا کے پادری کی طرف سے قرآن کریم کی بے حرمتی کی دھمکیوں اور گراؤنڈ زیرو میں مسجد کی تعمیر کی مخالفت کے بعد صرف امریکی دار الحکومت میں ۱۸۰؍ افراد نے اسلام قبول کیا ہے۔

محمد ناصر نے بتایا کہ پچھلے سال امریکہ میں سالانہ ۱۰۰؍ مساجد کے تناسب سے ۱۲۰۰؍ مساجد تعمیر کی گئی ہیں جو امریکہ میں تیزی کے ساتھ پھیلتے اسلام کی واضح علامت ہے۔ انھوں نے کہا کہ حیرت کی بات یہ ہے کہ امریکہ میں اسلام قبول کرنے والے مبلغین بن کر ابھر رہے ہیں۔ واضح رہے کہ امریکی پادری کے اشتعال انگیز بیان سے پوری دنیا میں تشویش کی لہر دوڑ گئی تھی۔ امریکی صدر اوباما سمیت کئی یورپی ملکوں کے سربراہوں نے اس نفرت انگیز منصوبے پر سخت نکتہ چینی کرتے ہوئے اسے عالمی امن کے لیے تشویش ناک قدم قرار دیا تھا۔ پوری دنیا کے دباؤ اور خاص طور سے مسلم دنیا میں پھیلی تشویش اور غم وغصہ کی لہر نے پادری کو اپنے منصوبے پر عمل کرنے سے باز رکھا۔ ذرائع ابلاغ نے یہ بھی فیصلہ کیا تھا کہ وہ اس ناپاک منصوبے کی زیادہ تشہیر نہیں کرے گا۔ ۱۱/۹ حادثے کی جگہ پر مسجد کی تعمیر کے فیصلے کی بھی اسلام دشمن عناصر نے کھل کر مخالفت کی ہے۔

برطانیہ میں حلال گوشت کی مقبولیت میں اضافہ

شریعت میں مسلمانوں کو جانوروں کو حلال طریقے سے ذبح کر کے حاصل کیے گئے حلال گوشت کھانے کی اجازت ہے اور اسی لیے غیر ممالک میں رہائش پذیر مسلمان جانوروں کو ممکنہ طور پر غیر شرعی طریقے سے کاٹے جانے کے باعث گوشت سے بنی اشیا اور غذائیں خرید کر کھانے میں ہچکچاہٹ کا شکار نظر آتے ہیں۔ تاہم حال ہی میں منظر عام پر آنے والی ایک خبر کے مطابق برطانیہ کے کئی مشہور تعلیمی اداروں، کھیلوں کے میدان اور اسپتالوں میں مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں کو بھی حلال گوشت پیش کیا جانا ایک معمول بن گیا ہے۔ برطانیہ کے مشہور ومبلے اسٹیڈیم کا رخ کرنے والے تماشائیوں اور مداحوں کو مکمل شرعی طریقہ کار کے تحت تیار کیے گئے گائے، مرغی اور بھیڑ کے گوشت کی اشیا فروخت کی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی برطانیہ کے سیکڑوں مشہور مقامات بشمول تعلیمی ادارے، اسکول، اسپتال، ریس کورس، اسٹیڈیم اور کئی ہوٹلوں میں صرف حلال طریقے سے تیار کیا گیا گوشت استعمال میں لایا جارہا ہے۔

مسجد اقصیٰ میں یہودی معبد کی تعمیر کا منصوبہ

مقبوضہ بیت المقدس میں مسجد اقصیٰ کے تاریخی اور اہم مقامات کو یہودیانے کی صیہونی مہم جاری ہے۔ مرکز اطلاعات فلسطین کے مطابق قابض یہودی مسجد اقصیٰ کے معروف مرکزی مقام البراق کی اسلامی شناخت مٹا کر وہاں ایک معبد تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ موصولہ اطلاعات کے مطابق صیہونی حکام نے عین مقام براق کے قریب کھدائیوں کا نیا سلسلہ شروع کیا ہے۔ صیہونی محکمہ آثار قدیمہ کی طرف سے ان کھدائیوں کو یہودی تاریخی آثار کی تلاش کا ایک ذریعہ قرار دیا گیا ہے، جب کہ عملاً یہودی اس مقام کی اسلامی شناخت مٹانا چاہتے ہیں اور اس کی جگہ یہودی معبد کی تعمیر کا ایک مذموم ارادہ رکھتے ہیں۔ اسرائیلی محکمہ آثار قدیمہ کے ڈائریکٹر دور تمان نے وزارت داخلہ کے زیر انتظام پلاننگ وتعمیرات کمیٹی کے ایک حالیہ اجلاس میں اعتراف کیا کہ آثار قدیمہ کے ماہرین مقام براق میں کھدائیوں کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں اور یہ کام اعلیٰ سطح کی حکومتی اجازت کے تحت ہو رہا ہے۔ ایک یہودی عہدے دار کا کہنا ہے کہ مقام براق میں جاری منصوبہ کے تحت ایک بڑی زیر زمین سرنگ کی کھدائی کی جائے گی تاکہ ہیکل سلیمانی کے آثار کو تلاش کر کے وہاں یہ معبد از سر نو تعمیر کیا جاسکے۔

خیر و خبر

جشن ولادت اعلیٰ حضرت و رضا اکیڈمی کولکاتا کا افتتاح

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں محدث بریلوی علیہ الرحمہ کے ۱۵۹ ر سالہ جشن ولادت کے مبارک موقع پر ۹ ر شوال ۱۴۳۱ھ مطابق ۱۹ ر ستمبر ۲۰۱۰ء کو رضا اکیڈمی کولکاتا کے آفس کا افتتاح عمل میں آیا، جو ناشر مسلک اعلیٰ حضرت جناب الحاج سعید نوری، چیرمین رضا اکیڈمی ممبئی کے زیر سرپرستی ہے۔

رضا اکیڈمی کولکاتا کے وسیع و عریض حال مین سیدنا اعلیٰ حضرت کے ۱۵۹ ر سالہ جشن ولادت کا شان دار اہتمام کیا گیا، جس میں کلکتہ کے علما و عمائدین شہر نے خاصی تعداد میں شرکت کی۔

اس مبارک موقع پر رضا اکیڈمی کولکاتا نے اعلیٰ حضرت کی بارگاہ میں خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ۹/۱۰ ر شوال المکرم مطابق ۱۹/۲۰ ر ستمبر کو سیدنا اعلیٰ حضرت اور حضور مفتی اعظم ہند اور علماے اہل سنت علیہم الرحمہ کی کتابوں کو خصوصی رعایتوں کے ساتھ دینے کی عظیم پیش کش کی۔ اس خاص رعایت کا فائدہ لیتے ہوئے کلکتہ اور اطراف و جوانب کے مسلمانوں نے "رضا اکیڈمی کولکاتا" کے آفس میں آکر کثیر تعداد میں کتابیں حاصل کیں۔

از: مفتی محمد مختار عالم رضوی، رضا اکیڈمی کولکاتا

دیارِ غیر میں دعوتِ اسلام کے امکانات

"عالمی سطح پر اسلام کے تئیں کافی بیداری آچکی ہے اور خصوصاً دیارِ یورپ و امریکہ کے باشندگان اسلام کے سلسلے میں کافی دل چسپی لینے لگے ہیں، اور اسلامی اصول پر یقین رکھنے لگے ہیں۔ اسلامی کتابوں کا مطالعہ اور اسلامک سینٹرز پر اسلام کے بارے میں شکوک و شبہات دور کرنے کے لیے لوگوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ یورپ کے ہوش ربا ماحول کی پیاسی روحیں کسی پر سکون پنگھٹ کی تلاش میں ہیں۔ یورپ و امریکہ میں تبلیغ اسلام کے روشن امکانات پیدا ہونے لگے ہیں، اس لیے اس دور میں عالمی سطح پر اسلامی مبلغین کی اشد ضرورت محسوس کی جارہی ہے۔"

مذکورہ خیالات کا اظہار مفتی ہالینڈ مفتی عبد الواجد صاحب نے اپنے دورۂ جامعہ حضرت نظام الدین اولیا کے موقع پر جامعہ ہذا میں منعقد استقبالیہ جلسہ بہ عنوان "دیارِ غیر میں دعوتِ اسلام کے امکانات اور طریقۂ کار" میں طلبہ، اساتذہ کے درمیان خطاب کرتے ہوئے کیا۔ واضح ہو کہ جامعہ نظام الدین اپنی نوعیت کا انفرادی ادارہ ہے جہاں علماے کرام کو دعوت و تبلیغ کی نئی تکنیک سے آراستہ کر کے بین الاقوامی سطح کا مبلغ بنایا جاتا ہے۔ موصوف نے تخصص فی الادب والدعوۃ کے طلبہ پر زور دیتے ہوئے کہا: "ایک مبلغ کے لیے اخلاق فاضلہ، پر کشش انداز و اطوار اور انسانیت کی اعلیٰ صفات سے مزین ہونا اشد ضروری ہے تا کہ اس کے صدق و صفا اور بہتر اخلاق سے اسلام کی بڑائی جھلکے" مفتی صاحب نے اپنے ایک گھنٹہ کے پر مغز خطاب میں طلبہ کے سامنے اپنی ان تمام مشکلات و تجربات کا خلاصہ کر دیا جس کا انھوں نے ۳۵ ر سال سے ہالینڈ کی سرزمین پر دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں مشاہدہ کیا۔

مبارک پور میں یومِ اقبال

علامہ اقبال کے یوم پیدائش کے موقع پر ۹ ر نومبر کو نگر پالیکا ہال میں نیو یوتھ لیگ کے تحت ایک سیمینار کا اہتمام کیا گیا جس میں اقبال کی حیات و خدمات پر روشنی ڈالی گئی۔ ان کے فلسفہ و تحریک کو فروغ دینے کا عزم بھی کیا گیا۔ اس موقع پر مختلف اسکول و کالج کے طلبہ و طالبات کے مابین تحریری و تقریری اور نظم خوانی کے مقابلے ہوئے جس میں مجموعی طور سے ۱۶۰ ر طلبہ و طالبات نے حصہ لیا۔ پروگرام کی صدارت چیرمین نگر پالیکا ڈاکٹر شمیم احمد اور نظامت نگر پالیکا کمپیوٹر سینٹر کے انچارج عامر فہیم نے کی۔

اس موقع پر ڈاکٹر شمیم احمد نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہم اردو والے بڑے خوش نصیب ہیں کہ ہمیں اقبال جیسا منفرد شاعر اور عظیم مفکر و فلسفی نصیب ہوا جس کے خیالات اور تعلیمات آج بھی ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں اور آنے والی نسلوں کے لیے بھی رہیں گے۔ انھوں نے کہا کہ اقبال کو یاد کرنا اور انھیں پڑھنا اپنی تہذیب کو یاد رکھنے اور پڑھنے کے مترادف ہے۔

تنظیم ابناے اشرفیہ کے جنرل سکریٹری مولانا مبارک حسین مصباحی نے اپنے خطاب میں کہا کہ علامہ اقبال صرف ایک شاعر ہی نہیں بلکہ ایک عظیم مفکر اور فلسفی بھی تھے۔ ان کی شاعری میں عشق و عرفان کا سوز و گداز بھر پور ملتا ہے۔ علامہ اقبال کا مقامِ امتیاز ان کا عشقِ رسول ہے۔

R.N.I. No. 29292/76 Regd. No. AZM/N.P.28

THE ASHRAFIA MONTHLY

Mubarakpur Azamgarh (U.P.) 276404 (INDIA) Ph. (05462) 250149, 250092, Fax:251448